گونگی حویلی

وجاہت علی سندیلوی

قیمت پانچ روپیہ

اردو پبلشرز ۵ تلک مارگ ۔ لکھنؤ

انتساب

نورِ دیدہ سراج عظمت کے نام

وجاہت علی

فہرست

تعارف

وجاہت سندیلوی

از تخلص بھوپالی

دودھوں پلے دودھ کے دھلے، خوش باش، خوش مزاج، خوش خوراک اور خوش اسلوب! یہ ہیں جناب وجاہت سندیلوی۔ بے ساختہ مگر باضابطہ ملک کے معروف طنز و مزاح نگار۔ اگرچہ اس دورِ یتیم میں اس قسم کی "خوش نسل" بننا تقریباً بند ہو چکی ہے۔ اب تو ہر بچہ روٹی طلب کرتا ہوا پیدا ہوتا ہے اور پھر روٹی ہی مانگتا ہوا اپنے خالق سے جا ملتا ہے۔ مگر وجاہت صاحب غلامی تا آزادی ٹٹولنے جانے سے قبل ایک زمیندار کے گھر پیدا ہوئے آنکھیں کھولیں تو گھڑوں اور مٹکوں تک میں خوشحالی بھری دیکھی۔ لیکن جب پیدائشی بھوک منگوں نے یلغار کی تو گھڑے بھی خالی اور مٹکے بھی! اب تو وجاہت صاحب اپنے خالی گھڑوں اور مٹکوں کو زمینداری کی باقی الصالحات جان کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں کہ کہیں کم ظرف انھیں خالی پاکر جی ہی جی میں خوش نہ ہونے لگیں۔

سرزمین بھوپال اپنے علمی، ادبی اور تاریخی نوادرات اور انکشافات کی وجہ سے مشہور رہے۔ محققین بھی تحقیق کر کے عاجز آ چکے ہیں۔ ہر پانچ دس سال کے بعد

کسی نہ کسی علمی خزانے یا ادبی شخصیت کی دریافت ہوتی ہے۔ چند سال قبل ڈاکٹر سلیم حامد رضوی مرحوم نے اُردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر کو بھوپال میں دریافت کرکے ادبی حلقوں میں ہلچل پیدا کردی تھی۔ اور ابھی حال میں شعر و ادب کے آخری تاجدار مرزا غالب کے قلمی دیوان کا نسخہ ایک کباڑی نے اپنے ذخیرے سے برآمد کرکے ایسی سنسنی پھیلائی کہ آج اس قلمی دیوان کی اہمیت غالب سے زیادہ ہوگئی۔ علمی و ادبی فضاؤں میں یہ دھماکہ خیز کیفیت تحلیل نہیں ہوئی تھی کہ راقم الحروف نے اسی سرزمین سے کرید کر وجاہت سندیلوی کو برآمد کیا کہ ہمارا محکمہ آثار قدیمہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

وجاہت سندیلوی کا مارچ ۱۹۱۶ء میں بھوپال میں ظہور ہوا تھا۔ چونکہ اس سرزمین کا خاصہ ہے کہ یہاں پیدا ہونے والے کے خمیر میں ظرافت کا پانچواں عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کیا عجب کہ وجاہت صاحب کی باغ و بہار طبیعت اسی حادثہ کی دین ہو۔ وجاہت سندیلوی اور خاکسار کی پیدائش میں دو سال کا فرق ہے۔ یعنی وجاہت صاحب کے پیدائشی اثرات زائل ہونے کے پورے دو سال بعد خاکسار "یا اخی یا اخی" کہتا ہوا نازل ہوا تھا جبکہ تمام کائنات طنز و ظرافت دم ساد ھے پڑی تھی اور ملک کے جید طنز و مزاح نگار اپنے اپنے گھروں میں بس پڑے ہوئے توبہ و استغفار کر رہے تھے۔

اگرچہ وجاہت سندیلوی میرے ہم وطن اور ہم مشرب ہیں لیکن مجھے ان کی زیارت سنہ ۱۹۶۷ء میں بمقام سندیلہ نصیب ہوئی۔ مجھے ایک تقریب کے سلسلہ میں سندیلہ جانا تھا۔ سندیلہ اسٹیشن پر اُترا تو ہو کا عالم تھا۔ لڈو کے شائقین اور لڈو کے فروخت کرنے والے ہی صرف باہم دست و گریباں دیکھے گئے۔ اور دور تک کوئی قلی دکھائی دیا اور نہ کوئی مزدور۔ ایک خوانچہ والے کو روک کر جو بڑی عجلت میں تھا قلیوں کی اس قلت کا سبب معلوم کیا تو اس نے بھنا کر جواب دیا۔ "واہ بابو جی خالی میں ٹیم خراب کر رہے

ہو۔ گاڑی دو منٹ ٹھہرتی ہے"۔ پھر ایک شریف صورت مسافر سے جو اپنا اسباب لادے ہوئے جا رہا تھا اس قحط الرجال کا ذکر کیا۔ مسافر نے انکشاف کیا۔ "یہ بستی شرفا کی ہے۔ یہاں محنت مزدوری اور بار برداری کے سب کام شرفا ہی اپنے ہاتھوں انجام دے لیتے ہیں۔ چنانچہ زیر لب۔ الحمد للہ میں بھی شریف ہوں" کہہ کر اپنا سامان اٹھایا اور اس شریفوں کی بستی کی طرف چل پڑا۔

دوسرے روز اپنے میزبان سے معلوم کیا کہ آپ کے شہر میں ایک بزرگ وجاہت سندیلوی ہیں جو ہنسی مذاق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میزبان اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لیکر چل کھڑے ہوئے۔ گل بکاؤلی کو حاصل کرنے کے لئے ایک بہت بڑی خشک جھیل کو پا پیادہ پار کرنا پڑا۔ جھیل انسانی غلاظتوں سے پٹی پڑی تھی۔ میزبان نے اس گندگی کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بے گھر دور کے لوگوں نے اس جھیل کو کوآپریٹو سوسائٹی کی طرز پر ٹٹی سازی کی صنعت کے لئے قومیا لیا ہے۔ غرضیکہ غلاظتوں پر نظریں ڈالتے، بچتے بچاتے اور منہ ناک میں رومال گھسیڑے اس مہم کو سر کر ہی لیا۔ اور دوسرے لمحہ وجاہت سندیلوی کے عالیشان محل کے سامنے تھے۔ گھر میں اطلاع کی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک سمجھدار بچی برآمد ہوئی اور جواباً کہا۔ "گھر پر نہیں ہیں۔ آپ اپنا نام بتلا دیجئے جب آئیں گے تو کہہ دیا جائیگا"۔ میں نے ایک کاغذ پر تخلص بھوپالی لکھ کر پرچہ بچی کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے پڑھا اور بڑی حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ ہیں تخلص صاحب؟" جی ہاں میں نے تائید کی۔ بچی نے پھر اپنے حواس جلدی ہی قائم کر لیا۔ "ارے تو آپ تشریف رکھیے۔ میں ملازم کو بھیج کر ابھی بلاتی ہوں۔" اور پھر گھر کے اندر تیز تیز قدموں کے ساتھ جاتے ہوئے ڈیوڑھی ہی سے چیخنا شروع کر دیا۔ "ارے وہ خالہ والے تخلص بھوپالی آئے ہیں اپنے ہاں۔ جسے دیکھنا

ہو دیکھ لو آ کے۔" بالکل اسی طرح جیسے سڑک پر سے کوئی اونٹ یا ہاتھی گزرے تو گھر کے بڑے لوگ بچوں کو اس عجیب الخلقت جانور کو دیکھنے کے لئے بچوں کو آواز دیتے ہیں۔ ابھی میرا ہاتھی اونٹ جیسا تعارف ہو ہی رہا تھا کہ وجاہت صاحب تشریف لے آئے اور بچوں نے اب اپنے بزرگ سے مجھ عجیب الخلقت کا تعارف کرایا۔ وجاہت صاحب مارے خوشی کے لال ہو گئے۔ اور مصافحہ کو میرے لئے کمتر درجہ کی چیز سمجھ کر معانقہ کے لئے اپنا سینہ بڑھایا۔ اور اپنے ہاتھوں سے مجھے لپیٹنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر روایتی اخلاق کے تحت کب آئے۔ کہاں قیام ہے؟ کب جاؤ گے کے ایسے سوالات کرتے ہوئے بڑی محبت سے مجھے بٹھالا۔ خاطر تواضع شروع کر دی۔ وجاہت صاحب اپنی خوشی اور مسرت کا کچھ اس طرح اظہار کر رہے تھے جیسے میں ان کی موروثی زمینداری کو واگزاشت کرنے آیا ہوں۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ کیونکہ نصف گھنٹہ کی ملاقات کے دوران وجاہت صاحب نے مجھے نصف منٹ بھی بولنے نہ دیا۔ چنانچہ موصوف کو اپنے سے زیادہ " صاحب زبان " پایا۔ احتراماً انھیں وجاہت بھائی کے نام سے خطاب کرنے لگا۔ وجاہت صاحب نے دوسرے روز صبح مجھے ناشتہ پر مدعو کیا۔ میں نے خیال کر کے کہ اگر آج کی طرح کل بھی باتیں سنائیں گے تو کوئی حرج نہیں کھانے کو بھی تو دیں گے۔ غرضکہ دوسرے روز صبح پہونچا تو دیکھا کہ ایک دس فٹ لانبی میز پر انواع و اقسام کے کھانے بڑی نفاست اور تمیز سے چنے گئے تھے۔ جس سے گھر کے لوگوں کی خوش سلیقگی کا پتہ چلتا تھا۔ بسیار خوری کی عادت بھی کبھی نہ کبھی کام آہی جاتی ہے۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے کھانے کی میز کربلو کا اجاڑ نقشہ پیش کر رہی تھی۔ اگر کسی نے وجاہت بھائی کے ہاں کھانا نہیں کھایا تو کچھ نہیں کیا۔ کاش لوگ ایسے حالات پیدا کریں اور ایسا لگتا

یا وکالتاً سفارش پہونچا کر کھانا کھانے کے مواقع حاصل کر سکیں تو یقین ہے کہ میری اس نیکی اور رہبری پر تاعمر میرے حق میں دعائیں کرتے رہیں گے۔

وجاہت صاحب ہمہ وقت صاف وشفاف اور دھلے منجھے رہتے ہیں کہ بعید نمازی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ مگر پتہ چلا کہ موصوف کمیونسٹ خیال کے ہیں۔ آج تک محو حیرت ہوں کہ وجاہت بھائی نے قدرت کے کاموں میں آخر ایسی کون سی کمی دیکھی کہ "انقلاب زندہ باد" ہو گئے۔ اور کس لئے مکہ چھوڑ ماسکو کے گن گانے لگے۔ حالانکہ اللہ نے زمیندار کے گھر پیدا کیا۔ اعلیٰ تعلیم سے نوازا۔ اور پھر کھانے کو اس قدر افراط سے دیا کہ دوسروں کو کھلانے کے لئے بھی بچ رہتا ہے۔ بخیر ہوگی کوئی مصلحت! یہ تو ہم ہوں گے کہ روز حساب اپنی اسلامیات پر گواہی دینے کے لئے چشم دید اور معتبر گواہوں کو میدان حشر میں ڈھونڈتے ہوں گے — وجاہت بھائی ٹھہرے ایل ایل بی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کی جوابدہی کیلئے کوئی جواب دعویٰ لکھ رکھا ہو۔

اُردو ادب میں تخمی طنز ومزاح نگاروں کے ساتھ قلمی اور پلے بیک طنز و مزاح نگاروں کی خاصی تعداد ملتی ہے جو طنز ومزاح نگاروں پر لکھ کر یا چند لطیفوں کی مدد سے اپنی بدیہہ گوئی یا بذلہ سنجی کی نمائش کرتے ہیں یا مغربی لٹریچر سے مزاحیہ ادب کے ترجمے کر کے یا چربہ اُتار کر داخل ادب کرتے رہتے ہیں۔ مگر وجاہت سندیلوی کا خاص تخمی طنز ومزاح نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ جنھیں طباعی، زندہ دلی اور بذلہ سنجی قدرت نے ودیعت کی ہے۔ بایں وجوہ طنز وظرافت کی اعلیٰ قدروں کے راز ورموز سے کماحقہ واقف ہیں۔ ان کی تصانیف دودھ کے دھلے، بے ساختہ، بے ضابطہ، طشت از بام، شریفانہ اور فطری طنز وظرافت کی نمائندہ تسلیم کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر غلام احمد فرقت نے جنھیں عالم طنز وظرافت میں

پیغمبر آخر الزماں کہا جاتا ہے وجاہت صاحب کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے
"وہ ایک محقق کا دماغ، ایک ادیب کا مزاج اور ایک طنز نگار کا شعور رکھتے ہیں۔"
"ان کے مزاحیہ مضامین اور خاکوں میں سنجیدہ مزاح اور گہرا طنز ملتا ہے۔"
"ان کی زبان شگفتہ ہے۔ روزمرہ اور زبان پر بڑی قدرت ہے۔"
وجاہت سندیلوی سیاست سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ لیکن تماشائی کی حیثیت سے۔ یعنی کنارے پر کھڑے ہوئے سیاسی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں اور یہ خوشی اور خاموشی خود اپنی جگہ پر بہت بڑی سیاست ہے۔ آج ہمارے نمائندے بھی بیس سال سے اسی سیاست کو اپنائے ہوئے ہیں۔ کیا مجال کہ کسی استحصال، تشدد، اور بے انصافی پر دو لفظ تو کہہ دیں۔
آزادی سے پہلے وجاہت صاحب یوپی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری نشر و اشاعت تھے۔ جب سرکار نے آزادی کے بعد دیوتاؤں کی زبان میں پروپگنڈا کرنا چاہا تو وجاہت صاحب نے اپنی زبان باہر نکال کر صدر کانگریس کمیٹی کو دکھائی ـــ "بھلا حضور! یہ نرم و نازک اور شستہ زبان آپکی زبان کا بوجھ کیونکر اٹھا سکتی ہے۔" عذر معقول تھا۔ یا صاحب صدر کانگریس پالیسی کے تحت اس قسم کا عذر سننے کے دل سے خواہش مند بھی تھے۔ فی الفور دھن یا دکھ کر استعفیٰ قبول کر لیا۔
وجاہت صاحب بڑے باغ و بہار مزاج کے انسان ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی طنز و ظرافت کے موتی بھی پرو جاتے ہیں۔ اس قلیل وقفہ میں موصوف کا ایک یہی لطیفہ ہاتھ لگ سکا۔ سندیلہ سے واپسی پر وجاہت صاحب کا لکھنؤ تک ساتھ ہو گیا۔ ایک بس سے ہم دونوں نے سفر کیا۔ ایک سیٹھ جی بھی ہمسفر تھے جو وجاہت صاحب سے بالکل لگے ہوئے بیٹھے تھے۔

اور بار بار نیند کے جھونکوں میں وجاہت صاحب کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیتے تھے۔ اور وجاہت صاحب سیٹھ جی کو بار بار ہشیار کرکے اپنی نشست پر واپسی کے لئے مجبور کر دیتے تھے۔ میں نے کہا ذرا اچھی طرح سیٹھ جی کو پابند کر دیجئے۔ فرمانے لگے "میرا کیا جاتا ہے۔ کمبخت خود اپنی نیند خراب کر رہا ہے۔" ایک قہقہہ بھر منہ سے برآمد ہوا۔ جس کے دھماکے سے سیٹھ جی بھی بیدار ہو گئے اور لکھنؤ تک بیدار ہی رہے۔

وجاہت بھائی خوبصورت چہرہ مہرہ رکھتے ہیں اور دلنشیں نقش و نگار کیا لگے ہیں۔ جس زاویہ سے نظر ڈالو جاذب نظر اور بھلے معلوم دیتے ہیں۔ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں سمر بزم کا یہ حال ہے تو اپنی جوانی میں کشش یوسفی کا کیا حال ہوگا۔

ہم جیسے بد قطع اور واہیات خد و خال اور دراوڑی رنگ کے لوگ اپنی ابلتی جوانی میں بھی عشق ورومانس سے ہمیشہ متعلق رہے۔ "سلام و پیام" کی بات تو علٰحدہ رہی کسی نے ایک پرچی بھی ہمیں کبھی نہیں لکھی کہ فلاں وقت آکر ملئے۔ آپ پر نظر ثانی گراں ہے۔" گھر میں اللہ کا شکر ہے۔ دو دو بیویاں موجود ہیں۔ کافی مانوس بھی ہیں۔ مگر ہماری شکل و صورت کو دل لگا کر دیکھنے کی آج بھی متحمل نہیں۔ اللہ اللہ ازدواج جیسا بے تکلف اور گھریلو رشتہ اور ادھر شرم و احتیاط کا یہ حال! ایک مرتبہ جب ہم ہوکر ہم نے دونوں سے اس عدم دلچسپی کا سبب دریافت کیا تو بڑی بیگم نے گھونگھٹ کی آڑ لے کر کہا "شرم آتی ہے" اور چھوٹی بیگم نے سہم کر جواب دیا۔ "دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔" بہر نوع زندگی تو گذر رہی ہے۔ وجاہت جیسی نہیں تو وکالت جیسی ہی سہی ؎

ہم اپنا سا قد دیئے جائیں یہ بھی کیا کم ہے
نہ ہو ہوائے گلستاں جو سازگار نہیں

انقلاب

(ایک ویرانہ۔ کچھ فاصلے پر شہر کی روشنیاں
جگمگا رہی ہیں۔ موسیقی کی غمناک صدائیں سنائی
دیتی ہیں۔ ایک نوجوان آہستہ آہستہ ویرانے
کے مرکز کی طرف بڑھتا ہے۔ اور رک جاتا ہے
اس کے سامنے کئی راستے ہیں۔)

نوجوان — میں کہاں آگیا ؟ کدھر ؟
یہ کون سا ویرانہ ہے ؟
یہ بنجر راستہ کس طرف جاتا ہے ؟
یہ غمناک فضا کیسی ہے ؟
اتفاقات کا بیٹا حوادث کا شکار !
میں اس طرف کہاں آن پڑا ؟
یہ دنیا مکر و فریب کی بستی ہے۔
یہاں ابلیس حکومت کرتا ہے۔

یہاں بھائی کا بھائی خون پیتا ہے۔
یہاں بیٹا ماں کی عزت کا سودا کرتا ہے۔
یہاں ہر گھڑی انسانیت کا خون ہوتا ہے۔
یہاں ہر قدم پر ایمان بکتا ہے۔
یہاں ہر کوئی بسمل اور گھائل ہے۔
یہاں ہر ایک کی زندگی دوسرے کی موت ہے۔
یہ قصائی کی دکان ہے۔
یہاں انسانی گوشت اور خون کا بیوپار ہوتا ہے۔
یہاں انسانی ہڈیوں کے انبار پر چڑھ چڑھ کر تہذیب و تمدن کے راگ گائے جاتے ہیں۔
یہاں مذہب کے نام پر قتل ہوتے ہیں۔
یہاں قانون کے ایما سے ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔
یہاں ریاکاری کا نام زہد
یہاں سیہ کاری کا نام عشرت کوشی
یہاں ہوس پرستی کا نام محبت
یہاں درندوں کا نام انسان ہے۔
یہاں ہر شے پر ملکیت کا قفل ہے۔
اور ہر قفل کی کنجی نفرت اور خود غرضی ہے۔
یہاں آنکھیں اندھی
کان بہرے
اور دماغ ماؤف ہیں۔

یہاں زندہ رہنے کے لئے صرف ننگی ہوس کی ضرورت ہے۔
یہاں محبت ایک کمزوری ہے۔
اور ایمانداری ایک بیماری ہے۔
یہ کیوں ہے؟ یہ کیسے ہے؟
یہ کیا اندھیر ہے؟
کیا خدا نے خدائی چھوڑ دی؟
یا اُسے شیطان کے ہاتھوں بیچ ڈالا۔
یہ اندھی لڑائی
یہ خون کی جھوٹی پیاس
یہ کیوں ہے؟ کیسے ہے؟
زندگی کے لئے؟
اور زندگی کیا ہے؟
کتنی سستی اور کتنی ذلیل؟
ایک تاریکی سے دوسری تاریکی کے درمیان چند قہقہے اور چند سسکیاں؟
کچھ بگاڑنے اور بنانے کی ناکام کوششیں۔
اور پھر خاموشی، مکمل خاموشی!
زندگی ایک خانماں برباد کارواں ہے۔
جس کی نہ کوئی منزل ہے نہ راستہ۔
مسافر منتشر، اور گم کردہ راہیں۔
ایک ہمسفر دوسرے کو لوٹ رہا ہے۔

اور ایک کے خون سے دوسرا سرخرو بن رہا ہے۔
یہ دنیا! اس کمینی اور پاگل دنیا میں
میں جاؤں کدھر!
(ساری فضا پر خاموشی چھا جاتی ہے۔ دفعتاً
پہلے ہلکے ہلکے اور پھر بہت زور سے طربناک
نغمے بلند ہوتے ہیں۔)
یک بیک ایک چھنا کے ساتھ ایک نیم عریاں حسینہ انتہائی والہانہ
انداز میں ناچتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ کچھ دیر تک وہ بڑے عشوہ و انداز سے
ناچتی رہتی ہے۔ اور پھر نوجوان کو دیکھ کر رک جاتی ہے۔
سرمستی۔ میرے عشرتکدے کے دروازے پر یہ کون سائل بے ہنگام ہے؟
نوجوان۔ میں ہوں ایک مسافر گم کردہ راہ!
سرمستی۔ اے گم کردہ راہ تو کدھر جانا چاہتا ہے؟
تو کس کی تلاش میں ہے؟
تیری یہ وحشی آنکھیں کیا ڈھونڈھ رہی ہیں؟
مجھے تیری جوانی پر رحم آتا ہے۔
تو لیوں اور کیسے کے پھیر میں نہ پڑ۔
یہ فکر و نظر کے دھوکے ہیں۔
رندی اور سرمستی کے بحر بیکراں میں غرق ہو جا۔
تیری شوریدہ سری اور بوالہوسی کا یہی علاج ہے۔
جا اور بمنستان حسن کی گلچینی کر۔
تو کانٹوں کے لئے کب تک روتا رہے گا؟

شک و شبہہ سے تیرا
دل دھڑک رہا ہے
لیکن جب اس کے پہلو میں کوئی دوسرا دل دھڑکے گا
تو یہ اپنی دھڑکن بھول جائیگا۔
جا! جا! دیر نہ کر۔
جوانی کا آفتاب موم کی طرح پگھل جاتا ہے۔
جا! جلدی سے کسی شوخ حسینہ کو سینے سے چمٹا لے۔
جوانی سرمستی کے لئے ہے۔
اور سرمستی جوانی کے لئے۔
اپنے غموں اور وسوسوں کے بوجھ کو
کسی کے سینے کی بھرتی ہوئی موجوں میں پھینک دے۔
تیرے منہ کی یہ تلخی
کسی کے لب شیریں سے ٹھیک ہو جائیگی۔
تیرے سینے میں جوانی کی دہکتی ہوئی بھٹی ہے۔
اسے شراب ناب کے چھینٹے دے۔
تیری آواز کی یہ کرختگی
بلوری جاموں کی کھنک میں گم ہو جائیگی۔
تیرے سینے کی سنگلاخ زمین
کسی کے عارض گلگوں سے نرم ہو جائیگی۔
تیرا سر غور و فکر کے لئے نہیں۔
کسی کے زانو پر رکھ کر سو جانے کے لئے ہے۔

تیری کڑکتی ہوئی جوانی کے لئے
دوشیزگی کی آغوش وا ہیں -
معطر شبستانوں کی سرخ روشنیاں
تجھے دیر سے دعوت دے رہی ہیں -
(حسینہ رقص کرنے لگتی ہے - اور جب نوجوان بولتا
ہے تو رک جاتی ہے -)
نوجوان - بس بس - اے بوالہوس بس !
تو مکر کے پردے میں
فریب کو پروان چڑھاتی ہے -
تیرے شبستانوں میں لطف و انبساط کی سسکیاں
آہ و بکا کے نالوں سے زیادہ رقت انگیز ہیں -
تیری دوشیزاؤں کے معطر جسموں میں
کوڑھ کے کیڑے اپنی غذا پا رہے ہیں
تو دل کو جگاتی ہے
اور دماغ کو سلاتی ہے
تو دل کے پھول کھلا کر
دماغ کے انگاروں کو ٹھنڈا کرتی ہے -
تو ایک گم کردہ راہ مسافر کو
شباب کی پُر خطر وادی میں لوٹنا چاہتی ہے
تو ہمیں حسن و عشق کے سبز باغ دکھا کر
ہمیشہ کے لئے قعر مذلت میں جھونکنا چاہتی ہے - ؟

تو ہمیں رنگ و بو کے فریب میں مبتلا کر کے ہم سے ہماری زندگی کا جوہر
چھیننا چاہتی ہے۔

تو ہمیں کمزور بنا کر
ذلیل و رسوا کرنا چاہتی ہے
مجھے تیری وہ شراب نہیں چاہیئے
جس میں کسی کے خون کی بو آتی ہے۔
مجھے دوشیزاؤں کے وہ بوسے نہیں چاہیئں
جن میں کچے گوشت کی لساندھ ہے۔
لعنت ہے اس محبت پر
جس کی نفرت نے آبیاری کی ہے
لعنت ہے اس عیش و عشرت پر
جس کی قیمت چند سکّے ہیں

(غمناک نغمے بلند ہوتے ہیں۔ جو رفتہ رفتہ دھیمے
ہونے لگتے ہیں۔ حسینہ سر جھکائے آہستہ آہستہ
جاتی ہے۔ اور تاریکی چھانے لگتی ہے۔ دفعتاً
ایک دھماکے کے ساتھ نغمات بلند ہوتے ہیں۔
روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ اور روپیوں کی جھنکار
سنائی دیتی ہے۔ زرنگار کپڑے پہنے ہوئے ایک موٹی
سی بھدی عورت بڑے غرور اور تمکنت سے
آگے بڑھتی ہے۔ اس کے جسم پر زر و جواہر کے
زیورات اور ہار ہیں۔)

دولت ۔ آ ! اے بھٹکتے ہوئے مسافر !
میں تجھے راستہ دکھا دوں ۔
معدہ خالی ہوتا ہے
تو دماغ بہکنے لگتا ہے ۔
میں دولت ہوں دولت !
خدا کی خدائی
میں نے خرید لی ہے
میں بحر و بر کی ملکہ ہوں
میرا ہر اشارہ قانون
میرا ہر لفظ فرمان ہے
عزت میری ٹھوکر میں
تہذیب میری لونڈی
اور مذہب میرا دربان ہے
عقل میری محتاج
علم میرا بھکاری
اور شرافت میری دست نگر ہے
میں جاہل کو عالم بناتی ہوں
اور عالم کو جاہل
میں احمقوں کو عنان حکومت سونپ دیتی ہوں
اور پاگلوں کو مختار کل بنا دیتی ہوں ۔
میں بوالہوس کو پارسا

اور فرشتے کو شیطان بنا دیتی ہوں۔
میرے حکم سے باپ بیٹے کو قتل کرتا ہے۔
اور میرے فرمان سے بیٹا ماں کی عزت لُٹتا ہے۔
میرے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں
ہر ناممکن کو ممکن بناتی ہوں
میں جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہوں۔
تو وہ شرم سے اپنی آنکھیں نیچی کر لیتی ہے۔
میں مردوں کو زندگی بخشتی ہوں
اور زندوں کی زندگی سلب کر لیتی ہوں۔
موت اور زندگی میرے کھیل ہیں
وہ میری ٹھوکریں میں چلتے ہیں۔
میرے ماتھے کی ایک شکن
بلیسوں ملکوں کو قحط کا شکار بنا سکتی ہے۔
میرے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ
ساری دنیا کو جنگ کے شعلوں میں جھونک سکتا ہے۔
میں دولت ہوں دولت!
یہاں ہر چیز کی ایک قیمت ہے
اور کون چیز ہے جس کی قیمت میں نہیں ادا کر سکتی؟
میں تریاق کو زہر
اور زہر کو تریاق بناتی ہوں۔
میں پہاڑوں کو سمندر

اور سمندروں کو پہاڑ بنا سکتی ہوں۔
(ہاہاہاہاہا۔ (قہقہے) ہاہاہاہاہاہا——)
میری فتح و نصرت کا چار دانگ ڈنکا بج رہا ہے۔
میری فتوحات سے آسمان بھی محفوظ نہیں۔
(ہاہاہاہاہا (قہقہے) ہاہاہاہاہا——)
اس دنیا کے وحشیوں کو
میں نے مہذب بنایا ہے۔
تہذیب میں نے بنائی ہے۔
تمدن میں نے بنایا ہے۔
حکومت میں نے بنائی ہے۔ سلطنت میں نے بنائی ہے۔
یہ سارا نظام کائنات میں نے بنایا ہے۔
کیا تو اندھا ہے؟ کیا تو بہرا ہے۔؟
میں اندھوں کو آنکھیں
اور بہروں کو کان بھی دیتی ہوں۔
کیا تو نہیں سنتا؟ کیا تو نہیں دیکھتا؟
آنا ہو تو آ۔
میرے قصر کے پھاٹک بار بار نہیں کھلتے۔
نوجوان۔ خاموش۔ کب تک یہ اپنی سمع خراش ڈینگ ہانکتی رہے گی۔
بس کر اے ام الخبائث بس کر!
تجھے یہ شیخیاں مارتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی؟
کیا تیرا نامۂ اعمال تیرے پیش نظر نہیں۔

کسان کا دہشت ناک چہرہ دیکھ
تیرے صدیوں کے مظالم کی تاریخ
اس پر جلی حرفوں سے کندہ ہے۔
کمر شکستہ اور امید باختہ مزدور کو دیکھ
اس کے گلشن ہستی کو کس نے تاراج کیا ؟
تیرے طلائی سکوں کی جھنکار میں
آج پوری انسانیت ابھی چیخ رہی ہے۔
ان یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کو دیکھ !
ان خانماں برباد قافلوں کو دیکھ !
اس ننگی اور بھوکی مخلوق کو دیکھ !
آہ ! یہ بھی کبھی انسان تھے !
یہ جنگ کے شعلے اور قحط کے سیلاب دیکھ !
یہ زخمی اور کراہتی ہوئی دنیا دیکھ !
آج ساری انسانیت کی گردن
تیرے آہنی چنگلوں میں ہے۔
تیرے طوفان کی زد میں
ہر مفلس کا نشیمن ہے۔
اور تیری بجلی کی زد میں
ہر دہقان کا خرمن ہے۔
تو نے کروڑوں بچوں کی گردنیں مروڑ دیں
اور تو نے کروڑوں نوجوانوں کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔

تو نے معصوم انسانوں کو پیشہ ور قاتل بنا دیا!
تو نے اچھوتی دوشیزاؤں کو عصمت فروش بنا دیا!
تیری تہذیب چھین جھپٹ اور لوٹ مار
تیرا آئین ضمیر فروشی اور تملق
تیرا مسلک مردم آزاری اور ریا کاری
تیرا مذہب سب و شتم اور جبر و ظلم ہے۔
کمزوروں کے خون سے تو نے اپنے لقمے تر کئے۔
اور انسانی ہڈیوں کے ساز پہ تو نے اپنے نغمے بلند کئے۔
تو نے انسان کی انسانیت کا جامہ تار تار کیا۔
اور اس کو درندوں سے بھی بدتر بنا دیا۔
تو نے ماؤں کی گودوں سے بچے چھین لئے
اور تو نے بھرے پُرے گھروں میں آگ لگا دی۔
تو نے انسان کی حمیت اور غیرت چھین لی۔
تو نے علم کا تاج اور عقل کی تلوار چرا لی۔
تو نے لہلہاتی ہری کھیتیوں کو روند ڈالا۔
اور تو نے کلیوں کو پھول بننے سے پہلے مسل ڈالا۔
تو نے اس مقدس سرزمین کو
جو اطمینان اور آسودگی کا
ترقی اور تعمیر کا گہوارہ بننے والی تھی
جہنم سے بھی بدتر بنا دیا۔
اور کائنات کے اس منتخب شاہکار میں

خون کے دریا اور آگ کے پہاڑ بنا دیئے !
یہاں کے نغموں اور قہقہوں کو
چیخوں اور سسکیوں میں تبدیل کر دیا۔
اُف! تیری سفاکیاں ناقابل بیان ہیں۔
جا! جا! اپنے قصر میں مُنہ چھپالے
قبل اس کے کہ وہ خاکستر کر دیا جائے !

(سناٹا چھا جاتا ہے۔ اور پھر بے ربط نغموں
کے درمیان بڑے غصے سے قدم بڑھاتی ہوئی عورت
واپس جاتی ہے۔ روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں
تھوڑی خاموشی کے بعد صرف ایک ہلکا سا
ساز بلند ہوتا ہے۔ پھر کھڑاؤں پہن کر چلنے
کی آواز آتی ہے۔ اور ایک بہت سن رسیدہ
بزرگ جو گیروے کپڑے پہنے ہوئے ہے
نمودار ہوتا ہے۔)

درویش — میں پہچان گیا۔ میں پہچان گیا !
میں نے تیرے دل کی آواز سُن لی
تیری روح اس دنیا کے دل کی بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔
تیرے نفس کو تربیت کی
اور تیری روح کو سکون کی ضرورت ہے۔
آ! اے نوجوان میں تجھے اپنی خانقاہ میں لے چلوں
اور میں تجھے سب سے اونچے منبر و محراب پر بٹھا دوں

پھر یہ دنیا کیا چیز ہے ؟
وہ دنیا بھی تیری ہے !
عرش تیرا ہے ! خدا تیرا ہے !
یہ دنیا ایک دھوکا ہے ۔
طاقت ایک نشہ ہے
اور دولت ایک سراب
تو ان مکروہات کی خاطر
اپنا خون پانی نہ کر
دنیا ہمیشہ سے ایسی ہی تھی جیسی کہ اب ہے
اور دنیا ہمیشہ ایسی ہی رہے گی جیسی کہ اب ہے
اس کے خمیر میں تاراج اور بدنظمی ہے
اس کے آب و گل کی خاصیتیں بدلی نہیں جا سکتیں
تو سمندر میں قطرہ نہ بن
تو قطرے کو سمندر کر دے
آ ۔ اس دنیا کو ٹھکرا کر میرے ساتھ آ
میں تجھے جنت کے لازوال چمنستان میں لے چلوں گا
اپنی قیمتی زندگی ۔ اپنی بے داغ جوانی
یہاں کے کھوٹے سکوں پر مت بیچ
آ ! اور شراب معرفت کے بحر بیکراں میں غرق ہو جا !
یہ دنیائے مکر و فریب تیرے لئے نہیں ہے
اس سے دامن جھٹک کر علیحدہ ہو جا

اس کے ٹمٹماتے ہوئے ظاہری چراغ بجھا دے
اور ان کے بدلے اپنے دل کا آفتاب طلوع کرلے

نوجوان ۔ سب قزاق ایک ہی کمیں گاہ میں بیٹھے ہیں ؟
تم مجھے کہاں لیجانا چاہتے ہو پیر خرف ؟
میں تمہاری منزل سے دور نکل چکا
بہت دُور !
تم مجھے عقل و خرد کے وسیع سبزہ زاروں سے
اوہام و روایات کی گندی گلیوں میں واپس لیجانا چاہتے ہو ؟
تم میرے تدبر اور تفکر کو مفلوج بنانا چاہتے ہو ؟
اور مجھے تقلید و تعصب کی زنجیریں پہنانا چاہتے ہو ؟
یہ دنیا عارضی اور بے حقیقت سہی
لیکن ہم لوگوں کے لئے جو کچھ بھی ہے یہی ہے
تم ایک عبرتناک غلط فہمی میں مبتلا ہو بڑے میاں !
تم نے دنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے بعد
مخالف سمت میں دوڑنا شروع کر دیا ہے
تم زمانے کے طوفانی دھاروں سے علیٰحدہ ہو کر
الگ اپنا ایک چھوٹا سا تالاب بنانا چاہتے ہو ۔
یہ تمھاری بھول ہے
تم مادی آلائشات کی دلدل سے بھاگنا چاہتے ہو !
لیکن اگرچہ تم نے اپنا سر آسمان کی طرف اُٹھا رکھا ہے
تم اس دلدل میں اور بھی زیادہ دھنستے چلے جا رہے ہو ۔

تمہارے تصوف کا پیچ و خم
زلفِ پیچاں کا دوسرا سلسلہ ہے
دنیا دوسروں کو دھوکہ دیتی ہے
لیکن تم اپنے آپ کو دھوکا دیے۔ ہے ہو۔
تم نفس کی تربیت نہیں کرتے
تم اس کو اور موٹا کر رہے ہو
تم روح کو سکون نہیں پہنچاتے
تم اسے موت کی نیند سلانا چاہتے ہو
تم زندگی کی جیتی جاگتی حقیقت سے
منہ چھپا کر اپنی کھوکھلی اور خیالی جنت میں کھو جانا چاہتے ہو !
تم خدا کو دنیا ومنت کا متمنی سمجھتے ہو ؟
اُسے عمل و حرکت کی ضرورت ہے
اُسے ترقی اور تعمیر کی خواہش ہے۔
تم نے اپنے خدا کو
اپنا ہی سا خود غرض سمجھ رکھا ہے
جو دنیا کی بدنظمی سے آنکھیں بند کیے
صرف اپنی تعریف اور توصیف سننا چاہتا ہے
تم عاقبت کے خواب دیکھ دیکھکر
جد و جہد اور کشمکش سے بھاگنا چاہتے ہو !
تم ایک بزدل مفرور ہو
تم ایک ہارے ہوئے جواری ہو

تم ایک اندھے خریدار ہو

(نانا ... اپنی داڑھی پکڑے ہوئے مایوسی سے جاتا ہے۔ فاصلہ پر ہلکے ہلکے غمناک نغمے بلند ہوتے ہیں۔ ہر طرف تاریکی چھانے لگتی ہے۔ پھر دفعتاً ایک طویل اور مہیب گرج سنائی دیتی ہے۔ پھر گڑگڑاہٹ کے بعد ایک دم سے بہت تیز زوردار اور بڑھتے ہوئے نغمات بلند ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی فوج آرہی ہو۔ روشنی تیز ہو جاتی ہے۔ نغمات دفعتاً بند ہو جاتے ہیں۔ کسانوں اور مزدوروں کا سُرخ پرچم لئے ایک قدآور بارعب انسان آگے بڑھتا ہے۔ اس کی آستینیں الٹی ہوئی ہیں۔ سر اور داڑھی کے بال گرد آلود اور پریشان ہیں۔)

انقلاب۔ تو سب کی جھکا سُن چکا
اب میری گرج بھی سُن
میری آواز میں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
اور میری کڑک سے چرخ نیلی فام لرزہ براندام ہے۔
میں خون کے سمندر سے نکلتا ہوں۔
اور آگ کے پہاڑ پر چڑھتا ہوں
میں آندھی ہوں، طوفان، بغاوت، انقلاب
میری آنکھوں میں انتقام کی وحشت ہے

میں سینہ تانے ۔ آستینیں اُلٹے
مرنے یا مارنے کے لئے نکلا ہوں ۔
میں شباب کی سرمستیوں میں
آگ اور خون سے کھیلتا جاتا ہوں
میں شمشیر بکف، کفن بر دوش ہوں
میں جان لیتا ہوں یا جان دیتا ہوں
میری چاپ سے قصر استبداد کانپتے ہیں
میری ٹھوکر سے تخت و تاج الٹ جاتے ہیں
میری ہیبت سے زمانہ لرزتا ہے
میں نظام عالم کا جارح بے رحم ہوں
میں کبھی معاف نہیں کرتا
میرا ہر نفس شعلہ ہے
اور میری ہر نظر بجلی
وہ زمانہ گیا جب میں بلکتا یا سسکتا
یا صرف چند حساس انسانوں کے دماغوں میں رینگتا تھا
اور مجھے میرے دشمن تمسخر سے دیکھتے
اب طوفان اور زلزلوں کی معیت میں
میں مردانہ وار میدان میں کودتا ہوں
اور اپنے دشمنوں کو شیر ببر کی طرح للکارتا ہوں
اور وہ لومڑی کی طرح بھاگ گئے ہیں
آ ۔ اے جواں مرد اگر تیرے دل میں ہمت

بازو میں قوت
اور دماغ میں احساس ہے
تو میرے ساتھ آ
میں آزادی اور مساوات کا سرخ پرچم لیکر نکلا ہوں
میں سماج کی آہنی زنجیریں توڑ دوں گا
میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز ختم کر دوں گا
میں یہ اندھی تقسیم بند کر دوں گا
میں کسانوں کے سڑے ہوئے ناسوروں
اور مزدور کی پسی ہوئی ہڈیوں کا معالج ہوں
میں اس پرانی دنیا
اس ناانصافی اور بے ایمانی کی دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔
یہ جاگیرداری اور سرمایہ داری
یہ ہوس رانی اور یہ خونخواری
میرے لئے ناقابل برداشت ہیں
میں ان کی گردنیں مروڑ دوں گا
میں ان کا نام ونشان تک باقی رکھنا نہیں چاہتا
میں آمریت کے دیو کو
خود اس کے خون میں غرق کر دوں گا
میں انصاف ہوں انصاف
میں دنیا کے ذرّے ذرّے کو
ذاتی ملکیت کے خونخوار پنجوں سے نکال کر

عوام الناس کا سرمایہ بنا دوں گا -
میں فکر و نظر کی ذہنی بیماریوں کو
اپنی قلم رو سے یک لخت دور کر دوں گا
میں ان فرقہ وارانہ مناقشات کے زہر کو
محبت اور اخوت کے تریاق سے ختم کر دوں گا
میں ان مذہبی دلالوں کو
جو سرمایہ داروں کے رشوت خوار ہیں
پُرامن انسانی بستیوں سے
کان پکڑ کر نکال دوں گا
کون ہے جو میرا راستہ روک سکے ؟
کسی کی مجال ہے جو مجھے ٹوک دے
میں خون کا پیاسا نہیں
میں قتل و غارتگری کا دلدادہ نہیں
میں امن کا علمبردار ہوں
لیکن اگر میرا راستہ روکا گیا
مجھے کشت و خون سے دھمکایا گیا
تو پھر میں ان گیدڑ بھبکیوں میں نہ آؤں گا
دنیا کے کشت و خون کے سدّباب کے لئے
میں کشت و خون کا ایک طوفان نوح لاؤں گا
اور خون کے اس طوفان میں
انسان کی تمام کمزوریوں کا بیڑا غرق کر دوں گا

پھر میں ایک نیا سنسار بناؤں گا
ایک نئی دنیا بساؤں گا
جس کی بنیاد امن اور مساوات پر ہوگی
اور جس کا خدا خود انسان ہوگا
جس میں انسان انسانوں کی طرح رہیں گے
جس میں خود غرضی اور مکاری نہ ہوگی
انسانوں کی ایک بیکراں برادری ہوگی
جس کی اخوّت اور محبت بے پناہ ہوگی
تیرے اور میرے کے جھگڑے نہ ہوں گے
سب کچھ تیرا اور سب کچھ میرا ہوگا۔
انسان آزاد ہوگا ! آزاد
صدیوں کی غلامی کے بعد آزاد
جسمانی زنجیروں سے آزاد
ذہنی قید و بند سے آزاد
ضرورت اور احتیاج سے آزاد
بیماری اور جہالت سے آزاد
اور اپنی آزادی میں ہر انسان
ایک جوہر یکتا ہوگا
مثل ایک سچے موتی کے بیش بہا اور دیدہ زیب
لیکن جس کی قدر و قیمت اور خوشنمائی
اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر

دوچندا ور سہ چند بلند بانگ ہے
اس ابنیت کا شیرازہ منظم اور مستحکم ہوگا
اور وہ انسانوں کی لازوال مسرتوں کا ضامن بنے گا۔
(سرمستی ناچتی ہوئی آتی ہے۔ اور کمر پہ ہاتھ رکھکر
کھڑی ہو جاتی ہے۔)
سرمستی۔ بس بس۔ تو نے میرے کان پکا دیئے۔
تو نوجوانوں کو حسن وعشق کی وادیوں سے
اغوا کر لے جانے پر تلا ہوا ہے۔
تو انقلاب اور بغاوت کے پتھروں سے
ان کے سروں کو چکنا چور کر دینا چاہتا ہے۔
تو دوشیزاؤں کی داد طلب نگاہیں نہیں دیکھتا۔
کیا وہ یوں ہی مایوس پلٹ جائیں گی ؟
تو جوانی کے پگھلتے ہوئے موم سے
فولاد بنانا چاہتا ہے ؟
جوانی سرمستی کے لئے ہے
اور سرمستی جوانی کے لئے
تو نوجوانوں کو ان ہی کے حال پر چھوڑ دے
ان کی فطرت کے تقاضوں کو مت بدل
گلشن حسن وعشق کی بہار بے خزاں کو
پامال کر ڈالنے کا خیال خام چھوڑ دے !
تو زندگی کے رشتۂ ارتباط کو

اپنے کرخت ہاتھوں سے کب تک توڑتا رہیگا ؟
تو وحشی ہے !
تو باغی ہے !
تیرا انسانوں کی بستی میں کام نہیں !
انقلاب ۔ کون بکتا ہے کہ میں حُسن و عشق کا دشمن ہوں ۔
میں حُسن کو حُسن واقع [illegible]
اور عشق کو عشق صادق [illegible] ـا ہتا ہوں
اس وقت تیرا حُسن محتاج ہے
تیرا عشق مجبور ہے
انقلاب ہی اس محتاجی اور مجبوری کو ختم کرسکتا ہے ۔
انقلاب سب سے بڑا حُسن کار ہے ۔
میں حسینوں کو واقعی حسین بنانا چاہتا ہوں
جن کی قیمت صرف چند سکے اور اندھیری رات نہ ہوں
میں خس و خاشاک کو صاف کرتا ہوں
تاکہ وہاں حسین کلیاں مسکرا سکیں
کیا کسان کی بیٹی حسین نہیں ؟
کیا مزدور کی بیٹی دلکش نہیں ؟
آہ حُسن کے نرم و نازک سینے پر
مجبوری اور بے چارگی کے پتھر کی سل ہے
میں عشق کو بوالہوسی کی گندگی سے نکال کر
ایک جذبۂ خود دار بنانا چاہتا ہوں

سرمستیاں سرمستوں کے لیے ہیں
لیکن اس وقت نہیں
جب جنگ گھمسان ہو
اور مورچہ سخت
آج نوجوانوں کے خون کی
تیرے شبستانوں میں ضرورت نہیں
آج ان کے خون کی
میدانِ جنگ میں ضرورت ہے
تو اپنی زبان بند کر
تو سرمایہ داری کا داشتہ ہے
تو نوجوانوں کو سبز باغ دکھا کر
اُن کو غداری پر مجبور کرتی ہے !
(سرمستی ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی
ہے اور نغموں کے درمیان بڑے غصے سے دولت
بڑھتی ہے -)
دولت - سُن - ! اے انقلاب کے بچے سُن !
تو پاگل ہے - تو سودائی ہے !
تو چند سر پھروں کی ناخلف اولاد ہے -
تو انصاف اور مساوات کے زبانی دعووں سے
اپنی بے رحمی اور خوں آشامی چھپانا چاہتا ہے -
تو انسانیت کے جسم پر سرطان کا پھوڑا ہے -

تو تہذیب کا دشمن ہے
تو سر پھری وحشت ہے
تو اندھا انتقام ہے
تیرا ہر قدم تخریب کا پیغام ہے
تیرا ہر نفس تعمیر کی منافی ہے
تو آگ بھڑکاتا ہے
لیکن اس کو بجھانا نہیں جانتا !
تو نہیں جانتا کہ تیری یہ جنگل کی آگ،
ایک روز خود تجھے بھی بھسم کر دیگی
اور اس وقت، تیری مشتعل کی ہوئی انسانیت
امن اور اطمینان کا سانس لیگی -
انقلاب - کہے جا ! کہے جا !
تیری یہ ہوس بھی پوری ہو جائے
میں پاگل ہوں - میں سودائی ہوں
کیونکہ میں تیری طرح ریاکار اور مکار نہیں
میں بھوکے پیٹ اور ننگے جسم کی آواز ہوں
میں کسان کی امید اور مزدور کی ڈھارس ہوں
میں بے رحم اور خوں آشام ہوں ؟
رحم اور تیرے لئے ؟
ہاں میں خوں آشام ہوں
میں خون بہاتا ہوں

لیکن سماج کا خون فاسد
جس نے انسانیت کے تمام جسم میں
خود غرضی اور مکاری کا زہر بھر دیا ہے
اور جو بغیر میرے نشتر کے نہیں نکل سکتا
میں خون فاسد بہاتی ہوں
اور تو خون دل !
میرے بہائے ہوئے خون سے
زندگی کے چشمے اُبلتے ہیں
اور تیرے بہائے ہوئے خون میں
ہلاکت کے اژدہے اینڈتے ہیں
میں تہذیب کی دشمن ہوں ؟
تہذیب اور تیری تہذیب !
قاتلوں اور ڈاکوؤں کی تہذیب !
میں اندھا انتقام ہوں !
ہاں تیری اندھی لوٹ کے لئے
میں تخریب کا پیغام ہوں -
ہاں اس تعمیر کے لئے جو کہ تو نے بنائی ہے
اور جس کی بنیادوں کے نیچے
کروڑوں انسانوں کی ہڈیاں چیخ رہی ہیں
دے گالیاں دے - چیخ چیخ کر گالیاں دے -
تو کتوں کی طرح بھونکے گی

لیکن میرا قافلہ بڑھتا ہی جائیگا۔
آج تو تہذیب کی محافظ بنتی ہے ؟
آج تو تمدن کی دعویدار ہے ؟
مکاری کی بھی کوئی انتہا ہونی چاہیئے !
کسانوں کے لئے کون سی تہذیب تھی
مزدوروں کے لئے کون سا تمدن تھا
کسان نے زمین سے سونا اُگلوایا۔
ساری دنیا کا رازق بنا
لیکن خود ایک ایک دانے کو ترس گیا
مزدور نے تیرے لئے کیا نہیں کیا ؟
تیرے لئے ساری خدائی کی نعمتیں اکٹھا کر دیں۔
لیکن خود ننگا اور بھوکا رہا۔
بس۔بس۔زبان سنبھال !
وقت کے تقاضے کے سامنے
سر جھکا دے۔!
اپنے کو فنا کے لئے پیش کر
زمانے کو تیرے خون کی ضرورت ہے
مظلوموں کی آہ و بکا کے درمیان
میں گرجتا گونجتا، اُمنڈتا، بڑھتا چلا آرہا ہوں۔
تو مجھے روک نہیں سکتی
مجھے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی

میں جب کسانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوں
تو جوشِ انتقام سے
ان میں سے چنگاریاں نکل پڑتی ہیں۔
جب میں مزدوروں کے بازوؤں کو مَس کرتا ہوں
تو ان سے خون کے دھارے اُبل پڑتے ہیں
بے روزگاروں کو، کاروان در کاروان دیکھ !
کیا یہ بپھرا ہوا سمندر
اب روکنے سے رُک سکتا ہے !

(سرمستی کے پاس ہی دولت کھڑی ہو جاتی ہے۔ درویش آگے بڑھتا ہے۔)

درویش ۔ تیری زبان بے لگام نے
مجھ کو بھی نہیں چھوڑا
تو خدا کی لعنت ہے
تو شیطان کی تبلیغ ہے
تو کفر ہے تو الحاد ہے !
تو ایک ذہنی طاعون ہے !
جہنم کے دہکتے ہوئے شعلے
تیرے منتظر ہیں
زبان دراز !
تو خدائی میں مخل ہونا چاہتا ہے ؟
رب کے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا !
نہیں ہو سکتا ! نہیں ہو سکتا !

انقلاب ۔ خاموش تم اپنا پھٹا ہوا بوریا بستر آسانی سے نہیں اٹھاؤ گے ؟
وہ ادنکھتا ہوا سادہ لوح انسان گیا
جسے تم پھسلا کر آسانی سے گمراہ کر سکتے
اب بالغ نظر والا انسان آرہا ہے ۔
جو خود اپنی قسمت کا مالک ہوگا ۔
اور خود اپنی دنیا بنائے گا ۔
سرمایہ داری کی سازش میں
تم بہت دن شریک رہے ہو
اب وقت آگیا ہے کہ تم
اس کے انجام میں بھی شریک ہو
جب مظلوموں کی ننگی پیٹھوں پر
ظلم وستم کے تازیانے برس رہے تھے
اس وقت تم کہاں تھے ؟
تمہارے حلق میں کیوں پھندا پڑ گیا تھا
جب کسان اپنی مصیبتوں سے نیم جان تھا
تو تمہاری خانقاہوں میں رنگ محفل جما ہوا تھا ۔
جب مزدور اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا
تو تمہارے منبر و محراب گونگے اور بہرے تھے !
تم نے اپنی گندی اور ناپاک حرکتوں سے
اپنے نیک ارادہ پیغمبروں کو بدنام کیا
تم نے مذہب کے نام پر قتل و غارت گری کی ۔

اور بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنایا -
تم نے انسانی عقل کے ارتقاء کو
اس کے فطری نشوونما سے باز رکھا
تم نے عقل کے انگاروں کو
ایمان کے پانی سے بجھا دیا
تم نے انسان کی سب سے بڑی توہین کی
تم نے خدا کو بندہ بنا دیا
اور اسے اپنی فرضی چہار دیواری میں محصور کر کے
اس پر اوہام کے پہرے بٹھا دیئے -

(سرمستی اور دولت کی صف میں درویش بھی کھڑا ہو جاتا ہے - نوجوان آگے بڑھتا ہے - جنگی نغمات بلند ہوتے ہیں -)

نوجوان - میرے رہبر - !
تم نے مجھے تاریکی سے روشنی میں لا کر کھڑا کر دیا -
مجھے اپنی منزل مقصود کا پتہ مل گیا
چلو اب دیر ہو رہی ہے -
افق پر رات کی تاریکیاں جھلملا رہی ہیں -

انقلاب - آؤ میرے رفیق
راستہ ناہموار ہے
اور منزل دور !
لیکن ہمارا عزم مستقل

ہماری ہمت لا محدود
ہمارے قدم اٹل
اور ہماری کامیابی یقینی ہے۔
ہمارے دشمن کمین گاہوں میں ہیں۔
لیکن ان کی موت، ان کی منتظر ہے۔
بڑھو بہادر سپاہی آگے بڑھو!
ایک انقلابی کی پوری شان سے
ہم سمندروں کو روندتے
اور پہاڑوں کو ٹھکراتے آگے بڑھیں گے
تلوار بے نیام کرو
اور سینہ تان لو
جنگ گھمسان ہے
اور مورچہ سخت
کودو، اس آگ کی بھٹی میں کودو
انقلاب کے لئے سر کٹانا ہی
سر کٹانے کا انعام ہے
بڑھو! میرے نڈر نوجوان آگے بڑھو!
اور بے لوث قربانی کے جوہر دکھاؤ
(نوجوان انقلاب کے پیچھے پیچھے جاتا ہے
جنگی ترانہ بہت زوروں سے بجتا ہے۔
سرمستی، دولت اور درویشی سراسیمہ

- نظر آتے ہیں - جنگی ترانوں کے درمیان
ہر چہار جانب سے انقلاب زندہ باد
کے نعرے بلند ہوتے ہیں -)

پردہ
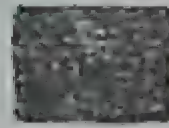
میں ایک معقول انسان ہوں اور اپنے سماج کی ایک ممتاز فرد!
کیوں ؟ —————— کیونکہ !
میں اپنی ضروریات سے زیادہ روپیہ کماتا ہوں ۔ میں خوشنما مکان
میں رہتا ہوں اور قیمتی اشیاء استعمال کرتا ہوں ۔
میں اپنے ہمجنسوں میں اخلاق سے پیش آتا ہوں ۔
میں اپنے والدین کی خدمت کرتا ہوں ۔
میں اپنے مذہب کا شدت سے پابند ہوں ۔
میں کبھی کبھار دو چار پیسوں سے غریبوں کی مدد بھی کرتا رہتا ہوں ۔
میں کسی قسم کا کوئی کوئی قانونی جرم نہیں کرتا ۔

میں کسی اخلاقی جرم کا بھی مرتکب نہیں ہوتا۔
یہ باتیں اور ایسی ہی بہت سی دوسری باتیں میری مقبولیت کا عمامہ اور
جبّہ و قبّہ ہیں۔ میں ان کو پہن کر شہر میں اکڑ اکڑ کر چلتا ہوں۔
لوگ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور میری تعظیم کرنا اپنا فخر سمجھتے ہیں
وہ میری تقلید کر کے خود بھی معقول انسان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔
اپنی عظمت، اپنی بزرگی اور اپنی مقبولیت دیکھ کر میں کتنا خوش
ہوتا ہوں۔
میں اپنی مقبولیت کا جامہ زیب تن کر کے آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں
اور اپنے اوپر آپ مسکراتا اور جھومتا ہوں۔
میں اپنے جبّے اور قبّے کو سمیٹ سمیٹ کر چلتا ہوں۔ مبادا اس پر کوئی چھینٹ
نہ پڑ جائے۔
لیکن کبھی کبھی مجھے ایک سنک بھی سوار ہوتی ہے۔
میں اپنی مقبولیت کا عمامہ اور جبّے اور قبّے کو اتار کر اپنے کو ننگا دیکھنے کی بھی
کوشش کرتا ہوں۔
میں اپنی ضروریات سے زیادہ روپیہ کماتا ہوں۔ کیوں ؟
کیونکہ میں نے ایک بہت بڑے سرمائے سے تجارت شروع کر کے اپنے
بہت سے ساتھیوں کی روٹیاں چھین لی ہیں۔
میں خوشنما مکان میں رہتا ہوں اور قیمتی اشیاء استعمال کرتا ہوں۔
کیوں ؟ ——
تاکہ لوگ میری امارت سے مرعوب ہوں اور ان پر میری ہیبت طاری ہو۔
میں اپنے ہمجنسوں میں اخلاق سے پیش آتا ہوں۔ کیوں ؟

کیونکہ میں ان سے اپنی خوشامد اور تعریف کی توقع رکھتا ہوں ۔
میں اپنے والدین کی خدمت کرتا ہوں ۔ کیوں ؟
کیونکہ میں ان کے سرمائے سے اپنے دوسرے بھائیوں سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہوں ۔

میں اپنے مذہب کا شدت سے پابند ہوں ۔ کیوں ؟
کیونکہ میرا زہد و تقویٰ بازار میں قیمت رکھتا ہے !
میں کبھی کبھار دو چار پیسوں سے غریبوں کی بھی مدد کرتا رہتا ہوں ۔ کیوں ؟ ـــــــ
کیونکہ ان کی فریاد اور آہ و بکا سے میرے ایک نامعلوم جذبے کی تسلی ہوتی ہے ۔
میں کسی قسم کا کوئی قانونی جرم نہیں کرتا ۔ کیوں ؟
کیونکہ میں جن جرائم کا مرتکب ہوتا ہوں وہ غیر قانونی نہیں ہیں ۔
میں کسی اخلاقی جرم کا بھی مرتکب نہیں ہوتا ۔ کیوں ؟
کیونکہ میرا پیسہ جس وقت چاہے سماج کا اخلاق خرید سکتا ہے ۔
یہ ہے میرے " معقول انسان " کا ڈھانچہ ۔
بلکہ اس سے بھی زیادہ مکروہ اور متعفن ـــ
میں اپنے ننگے جسم کو دیکھکر چیخ اٹھتا ہوں ۔
اور پھر جلدی جلدی اپنی معقولیت کا جبہ قبہ پہننے لگتا ہوں ۔
میں اس کی بخیہ کا ادھڑنا ہرگز پسند نہیں کرسکتا ۔
میں نے اس کی بہت بڑی قیمت ادا کی ہے ۔
وہ بڑی قیمت میرے ضمیر کی آواز، میرے دل کی تڑپ، میری روح کی آزادی

میری آنکھوں کی بینائی اور میرے کانوں کی سماعت ہے۔
میں تھکا ہوا غمگین انسان دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں کہ سب ٹھیک ہے۔
میں بھوک کے مارے مزدور کی کراہ سنتا ہوں اور اپنے کان بند کر لیتا ہوں۔
میں بیروزگاروں کو قافلہ در قافلہ دیکھتا ہوں اور منہ پھیر لیتا ہوں۔
میں حوا کی نرم اور نازک بیٹیوں کو گندی نالیوں میں سڑتا ہوا دیکھتا ہوں اور خاموش ہو جاتا ہوں۔
میں جانتا ہوں کہ یہ معاشی نظام سراسر ناانصافی، بے ایمانی اور درندگی پر مبنی ہے۔
لیکن میں اپنی جیب میں سینے کے قریب سکون کی گرمی محسوس کر کے کہتا ہوں کہ یہ یوں ہی ہوتا ہے۔
دنیا کا شیرازہ سراسر ابتر ہے۔ بھیڑیوں کی نگرانی بھیڑیئے کر رہے ہیں۔
لیکن میرے حلق سے جب آواز نکلتی ہے تو یہی۔ دنیا کے کام ایسے ہی چلتے ہیں۔
کاش کہ میں ایک دفعہ اپنی معقولیت کا جامہ تار تار کر سکتا اور اپنی پوری قوت کے ساتھ دنیا کے مظلوم طبقے کے ساتھ چیخ سکتا۔

"انقلاب زندہ باد"

لیکن نہیں!
میری بزدلی اور میرے تخیل کی پژمردگی میرے کام آتی ہے اور ان ہی کے طفیلوں میں ایک معقول انسان بنا پھرتا ہوں۔
میں ہوں ایک معقول انسان!
اپنے سماج کی ایک ممتاز فرد!

رمضانی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ گرم گرم تازی امرتیاں کھائے۔ اس کی جیب میں تین روپئے تھے۔ اس نے گھر پہونچتے ہی آکر کھول دیا۔ اور بیوی سے کہنے لگا ــــ "دیکھنا ابھی تمھارا منہ میٹھا کرتا ہوں۔ آج ایک آدمی نے بتایا ہے کہ اگر تین دن شام کو ہم تم بڑے پیر کی نیاز کر کے تازی امرتیاں کھالیں تو پھر ایک سال کے اندر ہی اندر تمھارے چاند سا بیٹا ہوگا۔

نصیبن ایک ڈنڈا لیئے چارپائی سے کھٹمل نکال رہی تھی۔ میاں کی باتیں سن کر وہ کھلکھلاتی ہوئی شرما گئی۔ بولی ــــ "تم کو بس ایسی ہی باتیں آتی ہیں۔"

رمضانی انگوچھا لیکر بازار چلا گیا۔ اور نصیبن جسے بیٹے کی بڑی چاہ تھی کھٹمل جھاڑنا بھول گئی۔ اور جلدی سے اپنی دھلی ہوئی ساڑی نکال کر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

شہر میں کئی دن سے خبریں گرم تھیں کہ ہندو مسلم دنگا ہونے والا ہے۔ اس سلسلے میں جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کوئی کہتا کہ مسلمانوں نے دہلی اور کانپور سے چاقو اور چھریاں منگائی ہیں۔ اور ان کو زہر کے پانی میں بجھا کر تیز کیا جا رہا ہے۔ کوئی کہتا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہندوؤں کے پاس بغیر لائسنس کی بندوقوں اور ریوالوروں کا ایک ڈھیر جمع ہے۔ کوئی کہتا کہ شہر کے باہر پنجابی مسلمانوں کا ایک لشکر ٹھہرا ہوا ہے۔ اور وہ کسی روز رات میں شہر پر لوٹ پڑے گا۔ کوئی کہتا کہ ہندوؤں نے آس پاس کے دیہاتوں سے ہزاروں آدمی بلا کر چھپا رکھے ہیں جو موقع ملتے ہی ایک ایک مسلمان کی کھوپڑی توڑ کر رکھ دیں گے۔ اس قسم کی سینکڑوں افواہیں اُڑ رہی تھیں۔ عام لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں۔ اور اس آنے والی مصیبت سے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ والوں کو کیسے بچائیں۔ کچھ لوگ عام لوگوں کی اس بے چینی اور پریشانی سے خوش بھی تھے۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیئے۔ لاٹھیوں پر تیل لگائے اِدھر اُدھر اکڑتے پھرتے اور جہاں کہیں دو چار آدمی دیکھتے فوراً اپنی بہادری، اور اگر دنگا ہوا تو وہ کیا کیا کر ڈالیں گے، کا راگ الاپنے لگتے۔ عام لوگ ان کی صورت دیکھتے ہی کانپ جاتے۔ شہر میں ہر گھڑی ڈر اور دہشت بڑھتی جاتی۔ دو دن پہلے ہی گاؤں میں بڑا خونی فساد ہوا تھا اور اس کے زخمی اور مرے ہوئے لوگوں کی لاشیں اب تک ہسپتال میں لائی جا رہی تھیں۔ ہر آدمی کو یقین تھا کہ اب دو تین دن کے اندر ہی شہر میں بھی دنگا ہو جائیگا۔ لیکن یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ آخر کیوں ؟ جس دن لالہ گوبردھن داس کی کوٹھی پر دو نئے بندوقچیوں کا پہرا لگایا گیا تھا اُسی دن رمضانی نے بھی

دس پیسے دیکر مسجد کے مولوی صاحب سے ایک تعویذ لکھوایا تھا۔ اور اپنے مکان، کے دروازے پر چپکا دیا تھا۔ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی آدمی بھی اپنی حفاظتی کارروائی سے غافل نہیں تھا۔

رمضانی نے جے رام حلوائی کے یہاں سے دو روپے کی سیر بھر امرتیاں تلوائیں۔ لیکن اس کے پہلے کہ دونا اس کے ہاتھوں میں پہنچتا رلیش پہلوان آگیا اور اس نے رمضانی کو دھکا دیکر جے رام کے بڑھے ہوئے ہاتھوں سے دونا لے لیا اور چلتا بنا۔ رمضانی روپیئے پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ اس نے جے رام سے بگڑ کر کہا ــ" لاؤ میری امرتیاں مجھے دو ــ"

جے رام جو رلیش کے ایکاایکی دونا اچک لیجانے سے بھونچکا سا رہ گیا تھا، کہنے لگا ــ" امرتیاں لوجا کر پہلوان سے میں تول چکا۔ اب میں کیا جانوں ؟ ــ"

بس اتنی ہی سی بات پر بات بڑھ گئی۔ رمضانی نے آستینیں چڑھائیں تھاں حلوائی نے گالی دی۔ رمضانی نے غصہ میں آکر اس کے مٹھائیاں بھرے دو تھال اٹھا کر زمین پر پھینک دیئے۔ جے رام کے لڑکے نے دکان سے نکل کر ایک بھرپور لٹھ رمضانی کے سر پر مارا۔ وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ اور اس کے سر سے خون کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا ــ اس گڑبڑ میں پچیس تماشائی جمع ہو گئے۔ ایک نے کہا ــ" ہندوؤں نے ایک مسلمان کو مار ڈالا ــ"

دوسرے نے کہا ــ" ہاں مار ڈالا، تو پھر کیا ؟ " پاس ہی ایک ہندو لڑکا کھڑا تھا۔ ایک مسلمان نے اس کے زور سے لات ماری۔ اور وہ نالی میں جا گرا۔

نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر! جے جے مہادیو! مارو، مارو! لینا! پکڑنا ــ

لاٹھیوں سے لاٹھیاں کھڑکنے لگیں - اور لوگ ایک دوسرے سے لپٹ پڑے - سارے شہر میں ہوا اڑ گئی کہ چل گئی - اور سچ مچ شہر میں اِدھر اُدھر چلنے لگی - گلی اور کوچے، جہاں بھولے اور معصوم بچے کھیلتے پھرتے تھے لڑائی کا میدان بن گئے - دنگا شروع ہو چکا تھا اور اب اُسے روکتا کون!

نعرۂ تکبیر اللہ اکبر، جے جے مہادیو! مارو اور مر جاؤ! دین کی عزت دھرم کی لاج! امن چاہنے والے لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس رہے اور میدان بالکل ہی لڑاکو اور خونی گنڈوں اور لٹیروں کے ہاتھ میں آ گیا — حیوانیت اپنی کامیابی پر ہنس رہی تھی اور انسانیت اپنا منہ چھپانے کی جگہ ڈھونڈ رہی تھی -

---

شام ہوتے ہی دنگا اور بھی بڑھ گیا - اندھیرا دنگا کرنے والوں کیلئے جیسے منہ مانگی مراد تھی - گلیاں اور اندھیرا، اور کام پر سے لوٹتے ہوئے تھکے ہارے مزدور! گنڈوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا خوب خوب موقع ملا - لاٹھیاں چل رہی تھیں - چھرے بھونکے جا رہے تھے، دروازے توڑے جا رہے تھے - دکانیں لوٹی جا رہی تھیں - مکان جلائے جا رہے تھے اور پھر چیخ پکار، بھگدڑ، عورتوں کا رونا، بچوں کا بلکنا، اور نعرۂ تکبیر اور جے جے مہادیو! لڑائی کے میدان کا نظارہ اس کے سامنے تھا سارا شہر آگ اور خون کے طوفان میں ڈوب چکا تھا - بڑی بڑی سڑکوں اور چوراہوں پر پولیس کے دو چار سپاہی بھی دکھائی دیتے - لیکن اتنی بڑی مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ کے بیچ وہ ایک مذاق کی چیز معلوم ہوتے تھے - سڑکیں سنسان تھیں اور گلیوں میں گنڈا شاہی تھی - ہاں بازاروں میں کہیں کہیں لاشیں پڑی

تھیں یا دکانوں کے لوٹے اور پھینکے ہوئے سامانوں کے پاس گھائل بڑی بے بسی سے کراہ رہے تھے - جب رات زیادہ گئی تو ہندو اور مسلمان غنڈوں کے بیس بیس، پچیس پچیس، تیس تیس کے گروہ باقاعدہ گھروں پر چھاپے مارنے لگے - مال اسباب کی طرح بیچاری گھر میں بیٹھنے والی عورتیں بھی لوٹی جا رہی تھیں - بوڑھی عورتوں کو تو مار ڈالنے کی کوشش کی جاتی - لیکن جوان عورتوں کو تھوڑی بہت شیطانی چھیڑ چھاڑ کے بعد ایک طرف اکٹھا کر لیا جاتا۔ آٹھ دس سال کی لڑکی تک کا شمار جوان عورتوں میں کیا جاتا - بچوں کو جوان اور بوڑھے مردوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ ختم کیا جاتا ـــــــ انسان کی انسانیت ختم ہو چکی تھی - اور صدیوں سے سوئی ہوئی اس کی حیوانیت اپنی اصلی شکل میں جاگ اُٹھی تھی - وہ درندوں سے بھی زیادہ بھیانک بن گیا تھا - بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر اُن کا سر دیوار پر دے مارا جاتا - بوڑھی عورتوں کو کوٹھے پر سے نیچے ڈھکیل دیا جاتا - روتے، بلبلاتے، ہاتھ جوڑتے انسانوں کے سینے میں بڑی ہی بے دردی سے چھرے بھونک دیئے جاتے - دم توڑتے جوانوں کے سینے پر اینٹیں دے ماری جاتیں - عورتوں کو ان کے باپ شوہر اور بچوں کے سامنے ننگا کر دیا جاتا - اور یہ سب کچھ دھرم اور مذہب کے نام پر تھا - دھرم کا بول بالا اور ادھرم کا منہ کالا -

پنڈت شیو شنکر کے بڑے دو منزلہ مکان کے پاس ہی بدلو کنجڑے کی کوٹھری تھی - پنڈت جی کی بزازے میں کپڑے کی بہت مشہور دکان تھی - اور وہ سارا دن وہیں رہتے - بدلو ہر روز مارکٹ سے چار چھ روپئے کی ترکاری اور پھل لے کر شہر میں پھیری کر کے بیچتا - اسی طرح اس کی ساری عمر بیت گئی تھی اور اب اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی - بیس سال سے پنڈت جی

کے یہاں وہی ترکاری دیتا تھا۔ بدلو کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ تین لڑکیاں ہوئی تھیں لیکن زندہ ایک بھی نہیں بچی۔ بیوی بھی مر چکی تھی۔ اور بہت عرصے سے وہ اکیلا ہی رہتا۔ پنڈت جی کے سب لڑکے اور لڑکیاں اس کی گود کے کھلائے ہوئے تھے۔ اور اسی کے ہاتھوں امرود، کیلے، سنترے، ناریل اور کمرکھیں کھا کھا کر پلے بڑھے تھے۔ وہ سب اس کو "بدلو چاچا" کہتے۔ بدلو جب شام کو واپس آتا تو ان بچوں کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ لاتا۔ اور یہ بچے بھی کچھ ایسا پرک گئے تھے کہ اس کے آنے سے پہلے ہی اُس کی کوٹھری کے سامنے اکٹھا ہو جاتے اور جب تک اس سے کھانے کے لئے کچھ لے نہ لیتے نہ ٹلتے۔ پنڈت جی روکھے مزاج کے آدمی تھے۔ وہ بدلو کو کبھی منہ نہ لگاتے اور گھر میں جب کسی بچے کو کھانسی آتی تو فوراً بدلو کو ہی ڈانٹتے۔ "یہ تم امرود اور کمرکھیں کھلا کھلا کر ان لڑکوں کو کھانسی لگاتے ہو۔ اب جو تم نے کسی بچے کو کچھ کھلایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

پنڈت جی جب بدلو کو ڈانٹتے تو سب لڑکے اور لڑکیاں چھپ چھپ کر سنتے اور جب پنڈت جی چلے جاتے تو بدلو کے پاس جا کر سب اُسے چڑھاتیں۔ "بدلو چاچا ڈانٹے گئے" "بدلو چاچا ڈانٹے گئے"۔ بدلو بہت موٹا منہ بنانے لگتا اور کہتا۔ "لاٹ صاحب کے پتلون کی قسم، اب کبھی تم لوگوں کو کوئی چیز نہیں دوں گا۔" اس پر لڑکے اور لڑکیاں اس کی خوشامد کرنے لگتے۔ بڑی دیر تک یہ قصہ رہتا اور آخر میں اس پر سمجھوتا ہو جاتا کہ کوئی لڑکا یا لڑکی پنڈت جی کے سامنے کھانسے گا نہیں اور بدلو برابر ان سب کو چیزیں دیتا رہے گا۔

پنڈت جی کی سب سے چھوٹی لڑکی راج کماری بدلو کو بہت زیادہ

پیاری تھی - وہ اس کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا - سب بچوں میں اسی کو سب سے زیادہ چاہتا - اور اسی کے لئے سب سے اچھی چیزیں لاتا - پھلوں کے علاوہ اکثر اس کے لئے کھلونے بھی لے آتا - راج کماری بھی اس سے بہت ہلی ہوئی تھی - گھنٹوں اس کے پاس کھیلا کرتی اور اس کی ہر ایک چیز کا اپنے کو مالک سمجھتی - اس کی ڈلیا میں سے جو چیز چاہتی بے دھڑک نکال لیتی اور کبھی کبھی جب اس سے خفا ہوتی تو اس کے لپٹ جاتی اور اس کی داڑھی خوب نوچتی - بدلو اس کی کسی بات کو برا نہ مانتا - راج کماری ذرا بڑی ہوئی تو وہ بدلو کا اور زیادہ خیال کرنے لگی - گھر میں جو کوئی بھی اچھی چیز پکتی وہ بدلو کے لئے ضرور الگ نکال کر رکھ لیتی - پنڈت جی کے پرانے کپڑے وہ بڑی محنت سے بدلو کیلئے درست کر دیتی اور بدلو کو اپنے پاس سے اپنے لئے کوئی کپڑا نہ بنوانا پڑتا - ایک بار بدلو بیمار ہوا - اور آٹھ دن چارپائی پر پڑا رہا تو راج کماری نے اس کی بڑی دیکھ بھال اور سیوا کی - پنڈت جی کی پتنی رُوپا دیوی کو بھی بدلو سے ہمدردی تھی - ایک دن انھوں نے بدلو سے کہا ”راج کماری کا بیاہ ہونے والا ہے بیٹی بنایا ہے تو اب کچھ خرچ بھی کرو۔“

بدلو نے جواب دیا ”میرے پاس تو جو کچھ بھی ہے راج کماری ہی کا ہے - اس کے لئے خرچ کرنا کیا مشکل ہے - میں اس کو سونے کے کنگن بنوا دوں گا۔“

رُوپا دیوی نے منہ بنا کر کہا ”لیکن بنوانے میں بہت خرچ ہو گا۔“

بدلو بے پرواہی سے بولا ”ہوں ! اس سے آپکو کیا مطلب ؟ یہ میں جانوں اور میری بیٹی۔“

بدلو کے کئی سو روپے راج کماری کے پاس جمع تھے -

پنڈت جی کا مکان بزازے کے پچھواڑے، نرائن ٹولے میں تھا۔ اس محلے میں زیادہ تر ہندوؤں کے گھر تھے۔

رات کو گیارہ بجے کے قریب مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہتھیار بند گروہ نے اس پر حملہ کیا۔ نعرۂ تکبیر "اللہ اکبر" سے سارا محلہ گونج اٹھا۔ اور اس کے ساتھ ہی عورتوں کا رونا اور بچوں کا چلانا اور لوگوں کی چیخ پکار کی بھیانک آوازیں بھی آنے لگیں۔ ہر طرف مار دھاڑ اور لوٹ مار شروع ہو گئی۔ بڑا ہی بھیانک سماں تھا۔ دس پندرہ گھر لوٹے گئے اور ان کے رہنے والوں کو بڑی ہی بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سات آٹھ گھروں میں جہاں دروازے نہیں توڑے جا سکے۔ پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کی لپٹیں ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔ ایک گروہ نے پنڈت شیو شنکر کا مکان گھیر لیا اور لاٹھیوں اور بلموں سے ان کا دروازہ توڑنے لگا۔

بدلو اپنی کوٹھری سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس سے نہ رہا گیا تو وہ پنڈت جی کے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور بلوائیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ "یہاں صرف پنڈت جی کے بال بچے رہتے ہیں ان کو ستانے سے کچھ نہیں ملیگا۔"

"تو کون ؟" کہہ کر ایک بلوائی نے بدلو کو گھسیٹ لیا اور بڑے زور سے اس کے ایک تھپڑ مارا۔

دو ایک اور بلوائی اس کو مارنے کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن کسی نے اس کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر کہا۔ "ارے یہ تو بدلو کنجڑا ہے۔" مارنے والے رک گئے اور بدلو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بڑا ہمدرد کا بچہ بنکر چلا ہے۔ حرامزادہ۔" بلوائیوں میں سے کسی نے کہا۔

پنڈت جی کا دروازہ ٹوٹنے ہی والا تھا کہ ایکدم سے بدلو دوڑ کر دروازہ گرانے والوں اور دروازے کے بیچ گھس پڑا۔ "میں دروازہ نہیں توڑنے دوں گا! نہیں توڑنے دوں گا۔"

"تیرا دماغ خراب ہے؟"

"دماغ خراب ہے تمھارا۔ بیچاری شریف عورتوں کو ستانے سے فائدہ؟" بدلو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس حرامزادے کو بھی جہنم پہنچاؤ۔"

"مارو مارو! سالے کو"

"یہ اسلام کا دشمن ہے" بھیڑ سے لوگوں نے کہا۔

"ہٹتے ہو یا پڑتی ہے لاٹھی؟" ایک بلوائی نے بدلو سے کہا۔

"نہیں ہٹوں گا۔ میرے جیتے جی تم ......" بدلو بات پوری نہ کر سکا۔ اس کے سر پر دو لاٹھیاں پڑیں۔ اور وہ بے سدھ ہو کر ڈیوڑھی پر گر پڑا۔

"بالکل پاگل ہی تھا سالا۔" ایک نے کہا۔

"اس غدار کا یہی حشر ہونا چاہیئے تھا" کسی اور نے کہا۔

تین چار بلوائی آگے بڑھے اور بدلو کو ڈیوڑھی سے گھسیٹ کر نالی کے پاس ڈال دیا۔ دروازے پر پھر لاٹھیاں، بلم اور ہتھوڑے برسنے لگے۔ یکایک پاس ہی سے "جے بجرنگ بلی" کا شور سنائی دیا۔

"ہندوؤں کا مجمع آ رہا ہے۔" کسی نے کہا۔ اور مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ کہیں سے دو تین بندوقیں چلنے کی بھی آوازیں آئیں۔ "بھاگو! بھاگ چلو!" کی آوازیں سنائی دیں اور جو مجمع پنڈت شیوشنکر کا مکان گھیرے ہوئے تھا وہ ایک طرف بھاگ نکلا۔

گلی میں پھر سناٹا چھا گیا ـــــ

مجمع کے جاتے ہی راج کماری گھر والوں کی آنکھیں بچا کر چور دروازے سے گلی میں نکل آئی - وہ ادپر کی کھڑکی سے دیکھ چکی تھی کہ بیچارے بدلو کا کیا حال ہوا تھا - اس نے فوراً زمین پر بیٹھ کر بدلو کا سر اپنی گود میں اٹھا لیا اور اپنی ساڑی کا پلّا نوچ کر اس کے ماتھے سے خون پونچھنے لگی -

بدلو دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا - راج کماری روتی جاتی ، اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتی جاتی ـــ " چاچا ! آنکھیں کھولو ، میں ہوں راج کماری ! "

" جے بجرنگ بلی " " جے مہادیو " " ہری اوم " کے نعرے لگاتا ہوا ایک بہت بھاری مجمع گلی میں گھس آیا - اس کے ساتھ گیس کی لالٹینیں بھی تھیں - بیچاری راج کماری ہکا بکا رہ گئی - اس کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی - اور وہ آنکھیں پھاڑ کر بھیڑ کو دیکھنے لگی -

بھیڑ میں سے ایک مہاشے نے بڑھ کر پوچھا " تم کون ؟ "

" راج کماری "

" اور یہ کون ؟ "

" چاچا "

" ارے یہ بدلو ہے - بدلو کنجڑا مسلمنٹا " ایک بلوائی نے چیخ کر کہا - لالٹینیں قریب آ گئیں -

" دم باقی ہے ابھی سالے میں ۔ سانس لے رہا ہے ۔ کسی اور نے کہا -

" ختم کرد، ختم کرد ! "

" مارو ! " بھیڑ میں سے کئی لوگوں نے کہا۔

ایک بہادر ہندو نے پینترا بدل کر بدلو پر بلم کا بھرپور وار کیا۔ لیکن اس کے پہلے کہ یہ وار بدلو پر لگتا راج کماری بیچ میں آگئی۔ بلم کا پھل اُس کی چھاتی کے آر پار ہو گیا اور وہ پھڑکتی ہوئی بدلو کے بے سدھ شریر پر گر پڑی۔

" مسلمنٹے کے پیچھے جان دیدی۔ ہائے ہائے "

ایسی کنیائیں اپنے دھرم کے لئے " کلنک کا ٹیکا " ہیں۔ اس کی یہی سزا ہے۔

" یہ عمر اور یہ عشق بازی ؟ "

" بے دھرم حرامزادی " بھیڑ کے لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

چھمی خالہ کی عصمت آپا سارے گھر کے لئے ایک وبالِ جان تھی۔ مجھے بھی ایک عجیب و غریب طریقے سے اس سے دوچار ہونا پڑا۔

میرا ماموں زاد بھائی اصغر میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اس کا بہت دنوں سے اصرار تھا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں، جو لکھنؤ سے چار گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ اور بالآخر ایک دفعہ دسمبر کی چھٹیوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ ہی لے گیا۔ ماموں دو برس گزرے ہوئے تھے۔ اور اصغر مجھے باہر کے کمرے میں بٹھا کر اندر ممانی جان سے میری آمد کی اطلاع کرنے چلا گیا۔ میں تھکا ہوا تھا۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے ایک طرف صوفے پر لیٹ گیا۔ دفعتہً کمرے کا بیچ کا دروازہ جو زنان خانے میں کھلتا تھا کھلا! اور ایک خوش اندام لڑکی سفید ساڑی پہنے گنگناتی ہوئی

آئی اور بغیر مجھے دیکھے ہوئے اس نے بائیں جانب شیشے کی الماری کھول کر اس میں سے ایک کتاب نکالی اور پھر چھمی دروازہ کی طرف چلی ـــ

دفعتاً اس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں ـــ اس کے منہ سے ایک سہمی ہوئی سی چیخ نکلی اور وہ بے تحاشا قالین پر گر کر بیہوش ہوگئی۔

یہ کیا ؟ ـــ میں دوڑ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ بیہوش ہونے والی لڑکی نہیں بلکہ اٹھائیس تیس سال کی ایک نازک خدوخال والی عورت ہے۔ جو آنکھیں بند کئے سسکیاں لے رہی ہے۔ مجھے پہلا خیال یہ گزرا کہ میں بیہوش ہونے والی کو اٹھا کر صوفے پر لٹا دوں۔ لیکن پھر مجھے اپنا ہندوستانی طرز معاشرت یاد آگیا جس میں ایک مرد کا کسی نامحرم عورت کے جسم پر ہاتھ لگانا انتہائی معیوب تصور کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد تھا کہ میری ایک رشتے کی چچی کے سینے میں پھوڑا تھا۔ لیکن اس کے متعلق انہوں نے مر جانا قبول کر لیا تھا لیکن یہ منظور نہیں کیا تھا کہ وہ اس کو کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھائیں ـــ میں عجیب مخمصے میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں ـــ کہ اتنے میں اصغر آگیا۔

"ارے چھمی خالہ بیہوش ہوگئیں ؟ یہ کیسے ؟"

"وہ آئیں اور مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر گر پڑیں۔"

اصغر جلدی سے پانی لایا اور چھمی خالہ کے چہرے پر چھینٹے دینے لگا۔ چند ساعتوں میں اُن کو ہوش آگیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میں اصغر کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کمرے کے باہر چلا جاؤں تاکہ چھمی خالہ کے پھر بیہوش ہو جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اصغر نے مجھے کمرے میں بلایا تو وہ جا چکی تھیں۔

میں ممانی جان سے ملنے اندر گیا تو پہلے تو جھمی خالہ نے مجھ سے پردہ کیا اور ایک کوٹھری میں جا چھپیں۔ لیکن جب ممانی جان نے ان سے پکار کر کہا۔ " دیوانی ہوگئی ہے۔ جھمی! آخر شبو سے کیا پردہ ؟ جیسا اصغر ویسا شبو۔ آخر ان کی ماں اور بہنیں معراج کے سامنے کیسے آتی ہیں ؟" تو جھمی خالہ بہت سہمی اور شرمائی ہوئی کوٹھری سے نکلیں۔ اور میری جانب سے گھونگھٹ نکال کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ میں نے سلام کیا تو انتہائی دھیمی آواز سے کہا " جیتے رہو "

انھیں دیکھکر، ان کی بے ہوشی والی واردات یاد کر کے مجھے ہنسی آگئی۔ اور اس کو ضبط کرنے کے لئے میں پوچھ بیٹھا۔ "کیا مزاج ہے آپ کا۔؟"

اس کا جواب اُنھوں نے یہ دیا کہ فوراً بھاگ کر پھر کوٹھری میں جا چھپیں۔ ممانی جان پکارتی ہی رہ گئیں اور بالآخر یہ کہہ کر چپ رہیں۔ " دیوانی تو ہے ہی ! "

کئی گھنٹوں تک ممانی جان اور ماموں زاد بہنوں سے باتیں کرنے اور گپیں ہانکنے کے بعد شام کو جب لائبریری میں میں اور اصغر تنہا ہوئے تو میں نے جھمی خالہ کا تذکرہ چھیڑا۔ مجھے ایک عجیب شخصیت معلوم ہوتی تھی اُن کی ! آج تک میں نے کسی عورت کو بیہوش ہوتے نہیں دیکھا تھا اور خصوصاً اس طور سے یعنی مجھے دیکھکر۔ وہ مجھ سے متاثر ہوگئی تھیں۔ یا ڈر گئیں تھیں ؟ میں نہ تو اتنا خوبصورت تھا اور نہ اتنا بھیانک۔ ایسے قصے تو صرف طلسم ہوشربا میں پڑھے تھے کہ فلاں شہزادی فلاں شہزادے کو دیکھتے ہی فوراً عاشق ہوگئی اور بیہوش ہوکر گر پڑی۔ لیکن اس قسم کے قصے بھی تو زیادہ تر شہزادیوں کی جانب نہیں بلکہ شہزادوں کی جانب منسوب تھے۔

اور ڈرنے کے لئے کیا صرف چیخ کافی نہ تھی؟ بیہوش ہو جانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن بیہوش ہو جانا تو شاید ایک غیر اختیاری فعل ہے۔

اصغر کہنے لگا۔ بھئی عجیب چیز ہیں یہ چھمی خالہ بھی! ایک ہفتہ میں یہ تین چار دفعہ بیہوش ضرور ہو جاتی ہیں۔ ان کو اپنے اوپر حادثات اور سانحات طاری کرنے کا شوق ہے۔ شروع شروع میں جب یہ ہمارے گھر آئیں تھیں تو میں ان سے بہت ڈرتا اور اب بھی میرے اور اماں کے علاوہ گھر کے سب لوگ ان کی عجیب و غریب حرکتوں کے باعث ان سے خائف ہی رہتے ہیں۔ ان کی والدہ ان کی پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں۔ اور ان کے والد ہمیشہ بسلسلۂ ملازمت ان سے دُور رہے۔ حتیٰ کہ ان کو ان کی صورت تک یاد نہیں۔ انکی تمام تر پرورش ان کی ایک بڈھی کھوسٹ اور حد درجہ جاہل اور توہم پرست نانی نے کی۔ اُس بڑھیا نے ایک بڑے سے سنسان گھر میں ان کے لئے انتہائی سخت گیر اور غیر فطری ماحول قائم کر رکھا تھا اور چوبیس گھنٹے میں ایک لمحے کے لئے بھی وہ ان کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ یہانتک کہ ان کو اپنے بہت قریبی خاندان والوں تک سے ملنے کی ممانعت تھی۔ ان کی عمر سولہ سال کی ہوئی تو اس بڑھیا نے اپنے پیر زادے ایک بڈھے مولوی سے ان کی شادی کر دی۔ مولوی بالکل ہی از کار رفتہ اور قبر میں پاؤں لٹکائے تھا۔ اس نے اپنے بڑھاپے کا انتقام چھمی خالہ کی جوانی سے خوب ہی لیا۔ وہ خواہ مخواہ ان کو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھتا اور ان کی انتہائی ظالمانہ حد تک کڑی نگرانی کرتا۔ اس کے سب دشتم سے بیچاری خالہ کا نخل زندگی بالکل ہی کچل کر رہ گیا! نہ اس میں بڑھنے اور اُبھرنے کی رہی سہی صلاحیت بھی

ختم ہوگئی - دس سال تک یہ اس کی قید میں رہیں - پانچ سال ہوئے جب وہ مولوی مر گیا اور اس وقت سے خالہ کو آزادی نصیب ہوئی - لیکن آزادی کس کام کی؟ خالہ کی روح کب کی مردہ ہو چکی ہے اور وہ غلامی کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ ان کو اپنی یہ آزادی غلامی سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے۔ آج دوپہر ہی میں وہ اپنے ظالم مولوی کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں - اب وہ اِدھر اُدھر اپنے عزیزوں کے ساتھ رہتی پھرتی ہیں - ایک سال سے اماں نے بلا کر رکھ لیا ہے - اب ان کا واحد مشغلہ اپنی عصمت مآبی کی تشہیر رہ گیا ہے -

اصغری کی زبانی چھمی خالہ کی کہانی سنتے میں ایک عجیب سوچ میں پڑ گیا - یہ آخر عورت کی عصمت مآبی ہے کیا بلا؟ اس کے متعلق نہیں معلوم ہم لوگوں کے اس قدر وحشیانہ اور متشددانہ جذبات کیوں ہوتے ہیں؟ مانا کہ یہ بڑی اچھی بات ہے - مذہب نے یہی بتایا ہے - اخلاق بھی یہی سکھاتا ہے - عقل سلیم بھی اسی کی طرف مائل ہوتی ہے - لیکن تب بھی اس کی اس قدر ضرورت سے زیادہ اہمیت کیوں ہے؟ آج ہر متوسط طبقے کے گھر میں چھمی خالہ کے چربے اور خاکے نظر آتے ہیں - لڑکیاں کیا ہیں کچلی ہوئی روحوں اور مسلے ہوئے جذبات کی زندہ نعشیں ہیں - زندگی کی تازگی، شباب کی تابندگی حتی کہ دل و دماغ کی پاکیزگی یہ سب کچھ بڈھی ناینوں، بدمزاج پھپھیوں، جاہل ماؤں اور نکتہ چیں بھاوجوں کے ہاتھوں حماقت اور جہالت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں - اور پھر اس عظیم الشان قربانی کے بعد غریب لڑکیوں کو کیا ملتا ہے؟ ————

——— عصمت مآبی ———

کیسی کچھ؟ کاش کہ کوئی ان نانیوں، چچیوں، ماؤں اور بھاوجوں کو سمجھا سکتا کہ عصمت تابی کا یہ جابرانہ ڈھونگ خود تمھاری بجبر عصمت تابی کی غمازی کرتا ہے۔ تمھارے خیالات گندے اور تمھارا ذہن مسموم ہے۔ تم جس ہور کو لڑکیوں کے معصوم قہقہوں، والہانہ ڈھلکے ہوئے آنچلوں اور الھڑپن کی اچک، پھاند اور تاک جھانک میں ڈھونڈتی پھرتی ہو۔ وہ درحقیقت خود تمھارے دماغوں میں چھپا بیٹھا ہے ——— لیکن یہ نانیاں وغیرہ خود بھی تو کبھی لڑکیاں تھیں؟ ——— تو گویا ایک نسل اپنے سے پہلے والی نسل کے ہاتھوں اپنے قتل کا اپنے سے بعد میں آنے والی نسل سے قصاص لیتی ہے۔ اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری ہے۔ کب سے جاری ہے ——— لیکن یہ کب تک جاری رہے گا؟ ———

مجھے خاموش دیکھ کر اصغر بولا۔ "چچمی خالہ مرد سے بیحد خائف ہیں۔ ان بیچاری کے دل میں سما گیا ہے کہ مرد جب کبھی آنکھ اٹھاتا ہے تو ہمیشہ بری نیت سے۔ اور اس کے سوا اسے دنیا میں کوئی دوسرا کام ہی نہیں ہے کہ وہ پرائی بہو بیٹیوں کو ورغلایا اور گمراہ کیا کرے"۔

خیر چچمی خالہ کی تو ایک غیر معمولی نوعیت ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو متوسط طبقے کی اسی فیصدی لڑکیوں کے یہی خیالات ہوتے ہیں۔ ہماری معاشرت میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان ایسا مصنوعی اور غیر فطری ماحول قائم کیا جاتا ہے کہ لڑکی لڑکے کو ہمیشہ "چور" اور لڑکا لڑکی کو ہمیشہ "چرانے والی چیز" تصور کرتا ہے۔ یہ ماحول قائم اس لئے کیا جاتا ہے کہ چوری نہ ہو۔ لیکن درحقیقت چوری روکنا تو درکنار یہ تو چوری کرنے اور چوری ہو جانے کے لئے اور بھی زیادہ ورغلاتا ہے"۔ میں نے کہا ———

"سچ ہے" اصغر کہنے لگا " ایک قیدی جیلخانہ کی چہار دیواری کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کی آزادی میں حائل ہے اور اس کی دائمی خواہش یہی رہتی ہے کہ وہ کسی طرح اس کو پھاند جائے - وہ کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اس دیوار کا ایک مقصد اس کی حفاظت اور اس کو موسم کی دست درازیوں سے بچانا بھی ہے "

اسی طرح کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں - کھانے کی اطلاع ہوئی تو ہم لوگ اُٹھ کر اندر چلے گئے - کھانے پر چھمی خالہ نہیں تھیں - معلوم ہوا کہ آج اُن کے سر میں درد ہے -

---

ممانی جان میرا ضرورت سے زیادہ خیال کرتیں - جتنی دیر میں ان کے سامنے رہتا ان کا سوائے اس کے اور کوئی کام ہی نہ تھا کہ وہ میری خاطرداری کرتی رہیں - میں ان کی عنایت اور شفقت کے اس سیلاب سے محجوب سا ہو جاتا - باورچی سے کہتیں " دیکھو شبو میاں کے لئے پلاؤ پکانا ہے - یہی تو ایک چیز ہے جسے یہ شوق سے کھاتے ہیں - ذرا محنت سے دیگچی اُتارنا -" گھر کے ملازم کلو کو حکم دیتیں " دیکھو شبو میاں کیلئے غسل خانے میں گرم پانی رکھ آؤ " عابدہ پر جھنجھلاتیں " اپنے بھائی میاں کے لئے پان نہیں بنائے تم دیکھتی نہیں کتنی دیر سے منہ خشک ہے " ملازمہ کو دوڑاتیں " ذرا فدو کے یہاں سے انڈے تو لے آنا - جتنے میں کہتی آتا شبو میاں کے لئے حلوہ بنیگا " شاکرہ کو سمجھاتیں " وہ جو تکیہ کے غلاف تم نے اپنے ابا میاں کے لئے بنائے ہیں وہ اپنے بھائی میاں کو دے دو - میں کپڑا منگا دوں گی - ان کے لئے دوبارہ بنا دینا -" غرضکہ نہ صرف اپنے لئے بلکہ سارے گھر کے لئے ممانی جان مجھے

زبردستی توجہ کا مرکز بنا دیتیں ——— اور میں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کرتیں ؟ ہندستانی لڑکی کی ماں بیچاری بڑی ہی غرضمند ہوتی ہے۔ ممانی جان ایک طرف تو مجھے سارے گھر کی توجہ کا مرکز بنانے کی کوشش کرتیں۔ اور دوسری طرف ان کی یہ بھی کوشش ہوتی کہ میری توجہ کا مرکز شاکرہ بنجائے۔ وہ مجھ سے جو کوئی بھی بات کرتیں اس میں شاکرہ کی مدح سرائی کا پہلو ضرور نکالتیں "شاکرہ اب کی اپنے درجہ میں اوّل آئی ہے۔ اسکے کالج کی ہیڈ مسٹریس بڑی تعریف کرتی تھی۔ کہتی تھی کہ میں نے اتنی سیدھی اور محنتی لڑکی تو کبھی دیکھی ہی نہیں۔ یہی محنت کا تو نتیجہ ہے کہ بالکل زرد ہو گئی ہے " میں نے کھڑکیوں کے کڑھے ہوئے پردوں کی تعریف کر دی تو فوراً خوش ہو کر کہنے لگیں " ارے یہ تو تمھاری بہن شاکرہ ہی کی کارگزاری ہے۔ اور یہ پردے کیا ؟ یہ تو تمھارے ماموں نے بڑی عجلت سے بنوا لئے تھے۔ بنانے ہی نہیں دیا غریب کو ورنہ وہ تو کاڑھتی کیا ہے ماشاءاللہ تصویر کھینچ دیتی ہے۔ کاڑھنے میں بھی تو اس کو اسکول میں انعام مل چکا ہے " کھانے میں ذرا دیر ہوئی تو ممانی جان نے کہنا شروع کیا " یہ باورچی تو اونگھ اونگھ کر کام کرتا ہے۔ ہاتھ ہی نہیں چلتا اس کا۔ ابھی پچھلے اتوار کو تمھارے ماموں جان رات میں نو بجے شکار سے لوٹے اپنے ساتھ بنیجر صاحب، بالس گاؤں کے ایک رائے بہادر صاحب اور ایک وکیل صاحب کو بھی لیتے آئے۔ اور آتے ہی شور مچایا کہ کھانا لاؤ۔ ہم لوگ دن بھر کے بھوکے ہیں۔ میرے تو ہاتھ پیر بھول گئے۔ باورچی گھر جا چکا تھا۔ اور رکھا رکھایا کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن تمھاری ان بہنوں شاکرہ اور عابدہ ہی کے دم تھے کہ جتنی دیر میں اُن لوگوں نے منہ ہاتھ دھوئے اور چائے پی۔ ان لوگوں نے پراٹھے، شکار کا قورمہ، انڈوں کا چلا، آلو کا بھرتہ اور سوئیوں کا مزعفر

تیار کر کے رکھ دیا۔ تمہارے ماموں کو تو یقین نہیں آتا کہ اتنی ہی دیر میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

شاکرہ سولہ سترہ سال کی موٹی سی لڑکی تھی۔ لیکن اس کا معصوم چہرا بڑا دلکش تھا۔ اس سے کام کے لئے کہا جاتا لیکن وہ گھوم پھر کر میرے ہی سامنے آکر بیٹھ جاتی۔ وہ مجھے کچھ عجیب دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی۔ لیکن جتنی دفعہ میں نے یہ کوشش کی ہر دفعہ ممانی جان آکر درمیان میں حائل ہو جاتیں۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے اب کیا مضامین لئے ہیں؟" لیکن قبل اس کے کہ شاکرہ بولتی چچی جان بول اٹھیں۔ "تاریخ اردو، فارسی اور انگریزی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اصغر تو مجھ سے کہتا تھا کہ یہ اکنامکس لیں گی۔" ممانی جان نے سلسلۂ کلام اپنے ہی ہاتھوں میں رکھا۔ "ان کی ہیڈ مسٹریس صاحب نے کہا کہ بس تم یہی مضامین لو۔ ان میں تمہیں بہت زیادہ نمبر ملیں گے۔" اسی طرح کئی مرتبہ میں نے شاکرہ سے بلاواسطہ گفتگو کرنا چاہی لیکن ممانی جان نے شاید اس خیال سے کہ وہ ان سے بہتر جواب نہیں دے سکتی اس کو بولنے ہی نہیں دیا۔ عابدہ صورت اور جسم میں شاکرہ ہی کی چھوٹی بہن تھی۔ لیکن وہ مجھ سے زیادہ بے تکلف اور خوب باتیں کرتی تھی۔

شام کو ہم سب برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ممانی جان کسی کام سے اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ میں شاکرہ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ میری باتوں کا بہت خوش ہو کر جواب دیتی۔ اتنے میں چھمی خالہ دوپٹے سے سوائے آنکھوں اور ناک کے سارا چہرہ چھپائے آگئیں اور شاکرہ کے پاس ایک

کنارے پر بیٹھ گئیں۔ میں نے سلام کیا۔ اُنھوں نے دوپٹے کے اندر سے ہونٹ ہلائے۔ لیکن میں کچھ نہ سُن سکا۔ میں نے شاکرہ سے پوچھا۔ "کبھی ایسے عمدہ کڑھے ہوئے تکیہ کے غلاف تو میں نے آج تک دیکھے ہی نہیں۔ بتاؤ اب میں تمھیں ان کا انعام کیا دوں؟" عابدہ بیچ میں بول اُٹھی "وہ سُرخ بیل والا میرا بنایا ہوا ہے۔ اور وہ آسمانی پھول بھی تو میں نے کاڑھے ہیں۔" شاکرہ تیز ہو کر کچھ بولنے ہی والی تھی کہ چھمی خالہ نے اُسے کہنی ماری اور وہ چپ رہی۔ چھمی خالہ نے کنکھیوں سے مجھے کچھ ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "ایک بھولی لڑکی کو بہکانا چاہتے ہو؟ خبردار!"

اتنے میں زاہدہ میری سب سے چھوٹی سات برس کی ماموں زاد بہن آگئی اور اصغر سے کہنے لگی۔ "بھائی جان میری بلی نے بچے دیئے ہیں۔ لیکن سب کالے ہی کالے ہیں۔"

"لیکن تمھاری بلی تو سفید ہے نا؟" اصغر نے کہا

"کلّو کہتا ہے کہ یہ پڑوسن کے کالے بلّے کے بچے ہیں۔"

زاہدہ نے ٹھنک کر کہا۔ "بھائیجان بتایئے بچے میری سفید بلی کے ہیں یا پڑوسن کے کالے بلّے کے۔"

"دونوں کے" عابدہ بولی۔

ایک جھناکے کے ساتھ چھمی خالہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ پڑی اور طشتری کے ساتھ چکنا چور ہو گئی۔ چھمی خالہ بے تحاشا اپنے کمرے کی طرف بھاگیں۔

دوسرے روز کوئی نو بجے ہوں گے میں اور اصغر باہر دھوپ میں بیٹھے

تاش کھیل رہے تھے کہ دفعتًا اندر مکان سے ایک دِل دوز چیخ کی آواز سنائی دی - اور اس کے بعد ہی کسی کے گرنے سے دھما کا ہوا - اصغر بھاگا اور اس کے پیچھے میں بھی ہو لیا - اندر پہونچکر معلوم ہوا کہ چھمی خالہ اپنے کمرے میں کپڑے بدل رہی تھیں اور دفعتًا کپڑے بدلتے ہی بدلتے چیخ مار کر گر پڑی ہیں - بڑی مشکل سے ان کی طبیعت قابو میں آئی - اور ممانی جان نے بہت ڈانٹ کر پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ ان کے کمرے کا پردہ ہوا سے ہلا تو انھوں نے دیکھا کہ کوئی آدمی سڑک پر عین ان کی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہے اور ان کو اشارے کر رہا ہے - یہ سُن کر شاکرہ اور عابدہ خوب ہنسیں اور ممانی جان ان پر دانت پیستی ہی رہ گئیں -

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ پھر باہر آکر بیٹھ گئے - سامنے سے کلّو گزرا میں نے اس سے کہا " دیکھو اندر برآمدے میں میں اپنی عینک بھول آیا ہوں لے آؤ -" اصغر نے بتایا " چھمی خالہ کی وجہ سے کلّو کو بھی اندر جانے کی ممانعت ہے - اس لڑکے کو شام سے سو جانے کی عادت ہے - لہذا روزانہ شام ہوتے ہی یہ کہیں چھپ کر سو جاتا ہے تاکہ جگایا نہ جا سکے - ایک روز شامت کا مارا یہ چھمی خالہ کے پلنگ کے نیچے گھس کر سو رہا - صبح کو اُنھیں معلوم ہوا تو ان کی دیکھنے والی کیفیت تھی - سارے گھر میں قیامت برپا کر دی - اور چیلنج دے دیا کہ اگر کلّو گھر میں آئیگا تو میں نہیں رہوں گی -"

دفعتًا میری آنکھ اُوپر کی طرف اُٹھ گئی - چھمی خالہ پردے کی آڑ سے جھانک رہی تھیں - میرے دیکھتے ہی اُنھوں نے بڑے زور سے کھڑکی بند کر دی ——— واقعی چھمی خالہ معمہ ہی تھیں -

---

شام کو کوٹھی کا مالی گردین کئی روز کی غیر حاضری کے بعد اپنی دلھن کو رخصت کروا کر واپس آیا تھا۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی دلھن اس کے ساتھ یہاں آئی تھی لہٰذا وہ اس کو سلام کرانے نانی جان کے پاس لے آیا۔ میں گھونگھٹ کی آڑ کی وجہ سے دلھن کا پورا چہرہ تو دیکھ نہیں پایا۔ لیکن اس کی جسامت سے پتہ چل گیا کہ وہ چودہ پندرہ سال کی ایک دبلی لڑکی ہے۔ گردین خود ایک بہت بڑا چوڑا چکلا قد آور جوان تھا۔ میں نے رات کو اصغر سے کہا " یہ تم نے گردین کی بے جوڑ بیوی دیکھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی لڑکی کو بیاہ لایا ہے "

اصغر بولا۔ " اس قسم کی بچپن کی شادیاں بھی عصمت تا بی ہی کے تحت کر دی جاتی ہیں "

میں رات کو بہت دیر سے سونے کا عادی ہوں۔ اصغر سو گیا لیکن مجھ کو نیند نہیں آئی۔ کچھ گرمی معلوم ہونے لگی تو میں نے اپنی مسہری کے پاس والی کھڑکی کھول دی۔ کوٹھی کا چمن چاندنی میں نہایا ہوا بڑا دلفریب معلوم ہوتا۔ فضا خاموش تھی۔ بیحد خاموش۔ اور انتہائی رومان انگیز۔ ہوا خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔ سبزے کے وسط میں کھجور کا نوخیز درخت ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی رقاصہ ناچتے ناچتے محفل کے درمیان جھک کر کھڑی ہو گئی ہو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دروازہ کھول کر چمن میں نکل گیا۔ آسمان چاند اور تاروں کی تمام سحر پاشیاں لئے کسی رند سرشار کی طرح گرا پڑتا۔ باغیچہ کے کونے پر کھجور کے دو اونچے درخت اس کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات پر کیف اور سنسان تھی اور چمن کا پتا پتا اس سے مسحور دم بخود تھا۔

" یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے " میں نے سوچا ——— اچانک

میں نے تھوڑے فاصلہ پر ایک سیاہی کا ٹکڑا دیکھا۔ "کوئی چھوٹا درخت ہوگا۔" لیکن وہ چل رہا تھا۔ اور سامنے سے دائیں طرف مڑ گیا تھا۔

—— وہ اب بھی چل رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ۔ میں نہایت خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ سایہ گردین کے جھونپڑے سے لگ کر کھڑا ہوگیا —— اور میں دھڑکتے ہوئے دل کیساتھ اس سے صرف دس گز کے فاصلہ پر پہونچ گیا۔ اب میں اس کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اس کا منہ دوسری طرف تھا اور وہ جھونپڑے کے اندر جھانک رہا تھا۔ میں اور آگے بڑھ گیا —— اب میں اس کو ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔

"کون ؟" میں نے کہا

سایہ سہم کر پلٹ پڑا۔ چھمی خالہ اپنے سفید کپڑوں پر سیاہ چادر اوڑھے کھڑی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے اُن کی آنکھوں نے مجھ سے آنکھیں ملائیں اور اس کے بعد وہ ہاتھ پھیلا کر میرے آغوش میں گر گئیں۔ اس وقت وہ بالکل بیہوش نہیں ہوئی تھیں۔ اُن کی سپردگی اور سرشاری میں ایک جلیتا جاگتا شعور تھا۔

—— قریب ہی کوئی بڑا سا پرندا اپنے پر پھڑپھڑاتا، قیں قیں چیختا اُڑ گیا۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے چھمی خالہ کی بڈھی نانی اپنے بال کھسوٹ کر بین کر رہی ہوں۔

——+——

چمپا صرف نام ہی کی نہیں بلکہ سچ مچ کی چمپا تھی اور خاص طور پر اپنے چمپئی رنگ کی وجہ سے۔ غریب کی جوانی کبھی بے داغ نہیں رہنے پاتی اور یہی حال چمپا کا تھا۔ حسین تو وہ تھی اور بلا کی حسین۔ لیکن اس کی بڑی بڑی دنبالہ دار آنکھوں کے نیچے دو ہلکے سیاہ نصف دائرے تھے اور اس کی آئینہ جیسی پیشانی پر سیاہی کی ایک دھندلی سی شکن دوڑتی ہوئی چلی گئی تھی۔ چمپا کا یہ دلفریب پھول خزاں کا ایک آدھ جھونکا کھائے ہوئے تھا۔ بیس اکیس سال کے سن میں کون حشر بداماں نہیں ہوتا۔ اور پھر چمپا تو واقعی حسین تھی۔ اس کے سینے میں ابھار، اس کی کمر میں لچک اس کی آنکھوں میں چمک، اور اس کے ہونٹوں پر شیرینی تھی۔ لیکن صرف

یہی نہ تھا - اس میں ایک خاص ترتیب، ایک تازگی، ایک بجلی اور ایک نامعلوم کشش بھی تھی جو اس میں عجیب شان امتیاز پیدا کر دیتی تھی اور اس کے ہر جاننے والے کے دل و دماغ پر اس کی شخصیت کا ایک گہرا نقش جما دیتی اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی جو بیان نہیں کی جا سکتی بلکہ صرف محسوس کی جا سکتی تھی - اور وہ یہ کہ اپنی انتہائی کوشش کے باوجود وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل جدا نظر آتی ——— وہ ایک رستوراں میں، گاہکوں کا دل لبھانے کے لئے ملازم تھی - اور اپنا یہ کام وہ اس خوش اسلوبی سے انجام دیتی کہ اس کا نتیجہ اس سے بہت زیادہ مطمئن اور خوش تھا - جیسا خود اپنے کام سے ایک آرٹسٹ کی طرح محبت کرتی - اس میں دلچسپی لیتی - اور گاہک تو اسے محض اپنی خوش قسمتی سمجھتے اگر انہیں اس کی خدمات حاصل ہو جاتیں -

" ابھی آئی "

" ابھی لائی "

" مٹن چاپ آ رہے ہیں اسی دم "

" حاضر ہوئی "

" لائی جناب "

" لیمونڈ ایک گلاس ؟ "

" آملیٹ ایک یا دو ؟ "

" نمک نہیں ہے ؟ ابھی لائی ہیں "

" چاول ؟ خشکہ یا پلاؤ "

"فرینچ ٹوسٹ! شکریہ نہیں ہے۔"
"چاپ سینکے جا رہے ہیں اسی دم۔"
"چائے نہیں آئی ابھی تک، اُفوہ۔"

یہ تھا چمپا کا کام دن بھر اور رات کے دس بجے تک۔ وہ ایک تتلی کی طرح گاہکوں کے درمیان ایک میز سے دوسری میز تک اُڑتی پھرتی۔ ہر گاہک یہی چاہتا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے چمپا کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اور چمپا حتی الامکان کسی کو مایوس نہ کرتی۔ اس کا ایک خاص معصومانہ تبسم تھا جو وہ بغیر کسی قید یا تعصب کے ہر گاہک کو مفت پیش کر دیتی۔ خواہ وہ بڈھا ہو یا جوان، خواہ متمول ہو یا مفلس۔ اور شاید اسی تبسم کا نتیجہ تھا کہ چمپا والے رسٹوراں میں ہر وقت چہل پہل اور ہما ہمی رہتی اور اسکی آمدنی دوسرے رسٹوراں کی آمدنیوں سے کہیں زیادہ تھی۔

اکثر نوجوان گاہک جو رسٹوراں میں محض چمپا کی خاطر آتے اس کو پریشان کرنے کی بھی کوشش کرتے۔ نہ معلوم کیوں ان میں اس غریب کی جانب سے ایک جذبۂ انتقام ہوتا۔ وہ کچھ اس قسم کے فقرے کہتے۔

"بی بی جان اِدھر آیئے۔"
"اس شربت میں کچھ اپنے ہونٹوں سے شیرینی بھی ملا دو۔"
"یہ گلاس اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر دیدو۔"
"سینما چلوگی ہمارے ساتھ۔"
"یہ کباب ہے یا کسی عاشق کا دل؟"
"اِدھر بھی دیکھ لیجئے۔"

" اس توس کو اپنی نظروں سے کاٹ دیجئے۔"
" بھاگ چلو... ہمارے ساتھ۔ اس ریسٹوراں میں کیا رکھا ہے۔"
" جوانی کا نکھار تو دیکھو! کہیں نظر نہ لگ جائے۔"
جمپایہ سب سنتی اور کھلکھلا کر ہنستی۔ وہ اس قسم کی باتیں اتنی زیادہ سُن چکی تھی کہ اس کو اب ان کے کہنے والوں پر ترس آجاتا۔ لیکن ان کی بات بنائے رکھنے کے لئے وہ ناک بھوں پر چڑھا لیتی یا مُنہ بنا کر اظہار ناراضگی کر دیتی۔ ریسٹوراں میں اُس کے پاس سوائے خوش ہولنے اور خوش کرنے کے کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ وہ ایک عجیب مسرت اور محویت میں ناچی ناچی پھرتی۔ گاہک اس پر پروانوں کی طرح ٹوٹتے اور صرف اس کو اپنی طرف مخاطب کرنے کے لئے بڑی سے بڑی کوشش کرتے۔ وہ تھوڑی دیر سب کے ساتھ کھیلتی۔ باتیں کرتی۔ لیکن پھر ہاتھ کسی کے نہ آتی۔ وہ ایک میز سے اُٹھ کر دوسری میز پر پہونچ جاتی اور وہاں ہنسنے بولنے لگتی۔ اس کا یہ ہرجائی پن اس کے چاہنے والوں کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکا دیتا۔

کبھی کبھار کوئی منچلا اس سے سنجیدگی کے ساتھ اظہار محبت کر بیٹھتا۔ اس وقت جمپا کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ وہ مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ جاتی۔ لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد کسی فطری جذبے کے ماتحت وہ جھینپ جاتی۔ اور اپنی بے وقت کی ظرافت پر ندامت محسوس کرتی۔ اکثر کوئی بیباک شوخ، زبردستی اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ مس کر دیتا۔ اُس وقت جمپا کا چہرہ سُرخ ہو جاتا۔ اور اس کے رخسار انگاروں کی طرح دہکنے لگتے وہ مُنہ پھیر کر چلی جاتی اور اس کی نظروں سے معلوم

ہوتا کہ اس کو یہ حرکت پسند نہیں ۔
اگر کوئی گاہک اس کے لئے کوئی تحفہ لاتا تو وہ بچوں کی طرح بغیر کسی اصرار کے قبول کر لیتی ۔ اور اس تحفے کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ۔ اُسے جوان گاہکوں سے بڈھے گاہک زیادہ پسند تھے اگرچہ وہ بھی اس کی جانب بڑی حریصانہ نگاہوں سے دیکھتے لیکن عموماً وہ زیادہ خاموش رہتے اور انعام میں اس کو زیادہ پیسے دیتے ۔
چمپا یہ بھی دیکھتی کہ بعض گاہک جنہیں ناشتہ کرنے کی کوئی حاجت نہ ہوتی اچھی سے اچھی چیز طلب کرتے اور پھر ان کو محض چکھ کر واپس کر دیتے اور جیب سے مٹھی بھر نوٹ اور روپیہ نکالتے اور نہایت لاپروائی سے بل ادا کر دیتے اور ایک ایک دفعہ میں اس کو کئی کئی روپئے انعام دے دیتے ۔ اور بعض گاہک ایسے ہوتے جو بڑی دیر تک رسٹوراں کے باہر منڈلایا کرتے اس کے بعد بہت دبتے اور جھجکتے رسٹوران میں داخل ہوتے اور پھر اگرچہ صورت سے وہ بہت زیادہ بھوکے اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے لیکن کئی دفعہ قیمتوں کی فہرست دیکھکر کسی نہایت سستی اور قلیل چیز کو طلب کرتے ۔ دام ادا کرتے وقت وہ اپنے بوسیدہ کپڑوں میں کئی دفعہ ہاتھ ڈالتے اور جیب کے اندر ہی اندر اپنے پیسوں کو گنتے ۔ وہ چمپا کو یا کسی دوسرے ملازم کو کچھ نہ دیتے بلکہ ان کی نظریں یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتیں " اور کچھ تمہارے پاس ہو تو ہمیں دیدو ۔" چمپا کو ایسے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی ۔
چمپا رسٹوراں کو اپنی سلطنت سمجھتی ۔ جب تک وہاں رہتی معصوم اور سادہ لوح بچہ معلوم ہوتی جس کا سوائے ہنسنے اور کھیلنے کے دوسرا کام ہی نہ تھا ۔ وہ نئی نئی وضع قطع کے لوگ دیکھتی اور خوش ہوتی ۔ ان سے باتیں

گرتی اور ہنستی ۔ ریسٹوراں میں ہر ایک چیز اور ہر ایک بات کی وہی مرکز تھی ۔ وہ سب کا کھلونا تھی اور وہ سب کو کھلونا سمجھتی ۔ اپنی اس زندگی سے وہ بہت خوش تھی ۔ بہت مسرور اور حد سے زیادہ مطمئن ——
لیکن اس کی ایک زندگی اور بھی تھی —— خوشنما کپڑے کے نیچے ایک گھناؤنا ، رِستا ، زہریلا اور گہرا ناسور ۔

جب سامنے کے گھنٹہ گھر میں رات کے دس بجتے تو چمپا ریسٹوران کی بزم آرائی چھوڑ کر ایک پوٹلی میں اپنا کھانا باندھے ہوئے نکلتی اور رات کی تاریکی میں گم ہو جاتی ۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ اُٹھتے اور اس کے چہرے پر ایک دہشت سی طاری ہونے لگتی ۔ جیسے کوئی قیدی قید خانے کی طرف گھسیٹا جا رہا ہو ۔ وہ گلی در گلی چکر کاٹتی ایک چھوٹے سے شکستہ مکان کے سامنے آکر رُک جاتی اور کنڈی کھٹکھٹاتی ۔ اندر سے ایک بڑے زور کی آہ کے ساتھ کوئی گھسٹتا ہوا آتا اور دروازہ کھول دیتا ۔
ریسٹوراں کے چہچہوں اور قہقہوں کے بجائے یہاں آہیں اور کراہیں تھیں ۔ چمپا کا مفلوج ، لنگڑا ، لولا شوہر اُسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا اور دانت پیسنے لگتا ۔ چمپا ایک زخمی شکاری کی طرح مکان میں داخل ہوتی اور سب سے پہلے اپنے تین سالہ بچے کو جو سو چکا ہوتا جگاتی ۔ وہ ماں کو دیکھتے ہی سسکاری بھرتا اور چمٹ جاتا ۔ اس وقت چمپا دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاتی اور اُسے معلوم ہوتا جیسے کوئی طوفانی موج اُسے کہیں بہائے لئے چلی جا رہی ہو ۔ وہ جب چونکتی تو اس کا شوہر جو پہلے ہی سے کھانے کی پوٹلی چھین کر چپڑ چپڑ کھانا شروع کر دیتا اسکو ڈانٹ رہا ہوتا ۔

"اب آئی ہو آدھی رات کو اپنے دوستوں کے یہاں سے اور رامو کو چھپائے بیٹھی ہو۔ نہ معلوم کب سے رو رہا تھا کھانے کے لئے۔ آخر وہ کھانا کھائیگا یا نہیں؟ چمپا اپنے ہاتھ سے رامو کو کھانا کھلاتی اور کھانے کے درمیان میں اُسے بار بار پیار کرتی جاتی۔ تھوڑی ہی دیر میں کھانا ختم ہو جاتا۔ اور بچا ہوا کھانا رامو کے ناشتے کے لئے رکھ دیا جاتا۔ چمپا کپڑے اُتارنے لگتی۔ رامو سو جاتا اور چمپا کا شوہر کرمو لڑائی کا مورچہ تیار کرنے لگتا۔ "کیا ملا آج؟" وہ پوچھتا۔

"ایک روپیہ" چمپا کہتی۔

"پھر وہی مکاری کی باتیں، سچ بتا۔" کرمو چیختا۔

"تمھیں کیا، تمھاری دارو بیر کے دام تو آہی گئے۔"

"بہت کھلتی ہے میری شراب تجھکو۔ اور اپنے بھی لچھن دیکھتی ہے تو؟"

"کیا ہیں میرے لچھن؟" چمپا پوچھتی۔

"بس پوچھو نہ! کیا میں دیکھتا نہیں، اندھا ہوں؟ سر پر مونگ دلتی ہے، سر پر۔"

"پھر کاہے کو بھیجتے ہو کمائی پر۔ خود کیوں نہیں جا کر کماتے۔ کیا میں روکتی ہوں۔ مجھے پرائی جوتیاں سیدھی کرنے کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جاؤ کماؤ جا کر، میں بیٹھونگی گھر میں۔ تم کمانا میں کھاؤنگی۔"

کرمو غصے سے بیتاب ہو جاتا۔ "پھر وہی جلی کٹی باتیں سال زادی — میں کماتا تو کیا کھلانے کے لئے تم ہی رہ گئی تھیں۔ اور جب میں پیسہ لاتا تو کھاتی نہ تھیں منہ پھاڑ پھاڑ کر۔ بڑی آئی ہیں قابل بن کر۔ میں اس قابل ہوتا

تو پھر تم یہ گلچھڑے کہاں اُڑاتیں۔ پتریا بنی بنی کیوں گھومتیں ؟"
چمپا یہ گالیاں سُن کر کٹکٹا جاتی ۔" ایک تو کماؤ، محنت مزدوری کر کے پیٹ بھرو۔ اور پھر اُوپر سے یہ گالیاں سنو! مجھے پتریا بننے کا شوق ہوتا تو تو یں تمھاری بہ سختی گرمی سننے کے لئے کاہے بیٹھی رہتی۔ جہاں سینگ سماتا نکل جاتی ۔"
کرمو جب دلائل سے گھبراتا تو پھر گالیوں پر اُتر آتا۔ خوب جی بھر چمپا کو گالی کوسنے دیتا اور دانت پیس پیس کر کاٹنے کو دوڑتا۔ چمپا تھوڑی دیر تک تو اس کی باتوں کا جواب دیا کرتی لیکن پھر روتی ہوئی خاموش ہو جاتی اور نہیں معلوم کبتک کرمو اکیلا رات کی تنہائی میں بکا کرتا۔ ایک مفلوج اور ازکار رفتہ انسان اپنی مجبوریوں کا غصہ اپنے سے زیادہ مجبور پر نکالتا۔
سویرا ہوتا تو کرمو اپنی رات کی باتیں بھول کر بے غیرتی سے چمپا کو پکارتا
" رامو کی اماں! رامو کی اماں!" چمپا سنتی اور نہ بولتی۔ لیکن پھر کرمو بڑے پیار سے چمکارتا ———
" چمپا!" اور چمپا آنکھیں مٹکا کر اور مُنہ پھلا کر کہتی۔" کیا ہے؟"—
" ارے کام پر نہ جاؤ گی آج ؟ " ———
" تمھیں کیا! اب میں گھر سے باہر نہ نکلوں گی۔ تم ہی جا کر کمانا ۔"
" اچھا ادھر تو آجاؤ میرے پاس ۔" اس وقت کرمو چار سال پہلے کی باتیں یاد کر کے اداکاری کرتا۔ ٹھنکتی ہوئی چمپا آجاتی۔" کیا ہے؟"
اور پھر دونوں میں نہ معلوم کیا سرگوشیاں ہوتیں اور دونوں ہنسنے لگتے چمپا رامو کو اُٹھا لاتی اور دونوں اسے بھینچ کر پیار کرتے۔ چمپا جانے لگتی تو

کرمو کہتا۔" ارے نسخے کے پیسے نہ دے گی؟ "

چمپا ایک روپیہ نکال کر دیدیتی۔ کرمو ہاتھ جوڑنے لگتا اور چمپا کے پاس جس قدر دام ہوتے پلو سے کھول کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتی۔ اور ریسٹوران چلی جاتی۔

یہ تھا چمپا کی زندگی کا دوسرا رُخ ___

چار سال پہلے کرمو بڑا بانکا جوان تھا۔ اس کا جکی کے پاٹ جیسا سینہ بلند و بالا قد، گٹھا ہوا پھرتیلا جسم اور پھر مسکراتی ہوئی آنکھیں جو کوئی دیکھتا دل ہی دل میں تعریف کرتا۔ وہ پیپر مل میں مشین چلانے پر ملازم تھا اور سو روپیہ مہینہ پاتا ۔ چمپا جب بیاہ کر اس کے گھر آئی تو اپنی خوش قسمتی پر رشک کرتی اور پھولے نہ سماتی۔ نیا نیا جوڑا تھا۔ نئی نئی راتیں تھیں اور نئی نئی باتیں۔ کرمو اور چمپا ایک دوسرے کی محبت میں حد درجہ سرشار اور بےخود تھے۔ سال بھر بعد جب رامو پیدا ہوا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہا لیکن پھر ایک دن ___

___ ان کی زندگی کی ساری بساط درہم برہم ہوگئی۔ نہ وہ محبت رہی اور نہ وہ مسرت۔ مشین چلانے میں کرمو کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں اور وہ کام کرنے سے بالکل ہی معذور ہوگیا محلے والوں نے کہا کہ کارخانہ میں درخواست دو شاید پنشن مل جائے۔ چنانچہ درخواست دی گئی۔ لیکن کارخانے والوں نے ایک نہ سنی اُنھوں نے کہا کہ کرمو نے اپنی ٹانگ کٹا کر مشین کو چار گھنٹے بند رکھا۔ اور اور ایک بڑا ضروری کام رک گیا جس سے ہمارا ہزاروں روپیہ کا نقصان ہوگیا۔

ہم اُسے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتے۔ کرمو نے اسپتال میں جب یہ سُنا تو کہنے لگا۔" اگر مجھے یقین ہو جائے کہ کارخانے والوں کا ہزاروں روپیہ کا نقصان پھر ہو جائیگا تو میں اپنی دوسری ٹانگ بھی کٹا لینے کے لئے تیار ہوں۔" مزدور سبھا کی بڑی کوششوں کے بعد اُسے صرف ایک ہزار روپیہ معاوضہ ملا۔

کرمو کی بیکاری کے بعد سے گھر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں فاقوں کی نوبت آگئی اور مجبوراً چمپا کو گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ اتفاق کی بات کہ اس کو ریسٹوران کی نوکری مل گئی۔ پہلے تو وہ اس نوکری سے بہت جھجھکتی اور الجھتی لیکن دو ہی چار مہینوں میں اس نے اپنے آپ کو اپنے ماحول کے مطابق بنا لیا۔ اور پھر تو یہ نوکری اُسے ایسی راس آئی کہ کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ اس نے وہ پَر پُرزے نکالے اور کام میں وہ کمال دکھایا کہ منیجر اور گاہک حتیٰ کہ وہ خود دنگ رہ گئی۔ کرمو لیٹے لیٹے یہ سب دیکھتا اور اپنا خون جگر پیتا۔ اُسے چمپا کی نوکری پسند نہ تھی اور وہ دن رات اس کے خلاف بڑبڑایا کرتا۔ لیکن مجبور تھا کیا کرتا۔ وہ قسمت کے محض ایک وار سے ایک دیو ہیکل انسان سے گوشت کا ایک لوتھڑا رہ گیا تھا۔ بالکل ہی بےکس اور بےدست و پا۔ اپنا غم بھلانے کے لئے اس نے لیٹے لیٹے شراب پینا اور محلہ والوں کے ساتھ جُوا کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ جو کچھ بھی چمپا ایک دن میں کما لاتی وہ دوسرے دن اسے شراب اور جوئے میں خرچ کر دیتا۔ بیماریاں الگ اس کا پیچھا نہ چھوڑتیں۔ دو دفعہ فالج کا حملہ ہو چکا تھا۔ اور کھانسی کا روگ تو لیا لگا تھا اس کے پیچھے کہ جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اور بالآخر اس کی

جان لبکر ہی گیا

کرمو کچھ نہ رہنے کے بعد چمپا تین چار روز تک گھر میں منہ لپیٹے پڑی رہی اور کہیں نہیں گئی۔ لیکن پھر رامو کو محلے کے ایک گھر میں چھوڑ کر ریسٹوراں پہونچ گئی۔ اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا اور اسے اب اپنے چاروں طرف کی دنیا بالکل ہی دوسری نظر آئی۔ ایک ہفتہ پیشتر جو ریسٹوراں اسے باغ و بہار نظر آتا تھا اب اس کے لئے ویرانے سے بھی بدتر تھا گاہکوں سے وہ آنکھ ملاتے شرماتی اور لجاتی۔ قدم قدم پر وہ غیرت کے مارے زمین میں گڑی جاتی۔ اس کے پیر ڈگمگاتے اور آنکھ اوپر نہ اٹھتی۔ نہ معلوم کون اس کے دل میں چٹکی لے لے کہہ رہا تھا کہ وہ بڑا پاپ کر رہی ہے۔ جن لوگوں کو وہ پہلے اپنا دوست اور محسن سمجھتی وہ لوگ تو بالکل نہ بدلے تھے۔ لیکن چمپا محسوس کرتی کہ وہ اس کے دشمن ہیں اور اس کی عزت و آبرو لینے کے درپے۔ چمپا اپنے آپ کو بالکل ہی بے یار و مددگار سمجھتی۔ اسے کچھ ایسا معلوم ہوتا کہ ابتک اس کی پشت پناہی کے لئے ایک پہاڑ کھڑا ہوا تھا۔ لیکن دفعتاً وہ پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور وہ جنگلی درندوں کے نرغے میں بالکل ہی تنہا رہ گئی۔ بار بار اس کی آنکھیں چھلک اٹھتیں لیکن وہ اندر ہی اندر اپنے آنسو پی جاتی۔

ریسٹوراں کا کام ختم ہوا تو وہ اپنی جان لے کر بھاگی۔ گھر پہونچی تو پہلے حسب معمول دروازے کے اوپر کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ لیکن جب کسی "آہ" کی آواز سنائی نہ دی تو اسے یاد آیا کہ وہ خود ہی نیچے کی کنڈی میں قفل لگا کر گئی تھی۔ قفل کھولا اور رامو کو دوسرے گھر سے لے آئی۔

پھر مکان کے اندر داخل ہوئی۔ آج کرمو نہ تھا جو اُسے گھر میں قدم رکھتے ہی گالی کوسنے دیتا۔ چمپا کا دل بھر آیا اور وہ دہلیز چوکھٹ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رات بھر چمپا کو کرمو کی باتیں یاد آتیں رہیں، پیار کی باتیں کم اور غصے کی زیادہ۔ اب اس پر کوئی غصہ کرنے والا باقی نہ تھا اور اُسے سب سے زیادہ اسی کا ملال تھا۔ اس کی مثال ایک ایسی چڑیا کی تھی جو عمر بھر پنجرے میں بند رکھی گئی ہو اور پھر جب اُسے پنجرے سے باہر نکال کر پھینک دیا گیا ہو تو وہ پنجرے کے لئے رو رہی ہو۔ چمپا کو یہ خیال کھائے جاتا تھا کہ وہ آزاد تھی بالکل آزاد۔ اپنے ہر قول و فعل کے لئے خود مختار۔ وہ خود اپنی مالک تھی اور کسی کا اس پر دباؤ نہ تھا۔ وہ رو رہی تھی اپنی محکومیت کے لئے۔ وہ رو رہی تھی اپنی مظلومیت یاد کر کے۔

دوسرے دن اپنی انتہائی کوشش کے باوجود چمپا کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ریسٹوران جائے۔ اور پھر یہ ہمت کبھی نہیں پڑی۔ وہ اپنے مکان کے دروازے ہی پر چاٹ کا خونچہ لگانے لگی۔ ایک دفعہ کسی محلہ والی نے پوچھ دیا۔

"چمپا تو کام پر کیوں نہیں گئی تھی؟"

چمپا نے فوراً چٹک کر جواب دیا۔

"اپنے مرد کے سامنے کی اور بات تھی۔ اس کے بعد کسی دوسرے مرد سے آنکھیں ملاتے لاج آتی ہے"

خیراتی ہانپتے ہوئے اپنا سینہ پکڑ کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اس کا آج پھر دم پھول رہا تھا۔ اور سینے میں درد شروع ہوگیا تھا۔ وہ اس زور سے ہانپ رہا تھا جیسے اس کے سینے میں دھونکنی چل رہی ہو۔ سانس پھیپھڑوں میں سماتی ہی نہ تھی۔ دو چار منٹ تو وہ بالکل ہی بےحال رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ تھوڑی دیر بعد قابو میں آ گیا۔ سامنے چائے والے کی دکان پر اس نے ایک پیالی چائے پی اور پھر اپنا رکشہ اٹھا کر اڈے کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کے انداز ہی سے معلوم ہوتا کہ اب آج کی رات اُسے کوئی اور مزدوری نہیں کرنا ہے۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی یوں ہی بڑے زوروں سے پڑ رہی تھی لیکن آج کی رات تو خصوصیت کے ساتھ غضب کی ٹھنڈک تھی۔ تیز برفانی ہوا کے جھونکے بدن میں تیر و نشتر کی طرح چبھتے چلے جاتے۔

سارا آسمان بادلوں سے گو نجا پڑا تھا - اندھیاری جھکتی ہی جا رہی تھی - جیسے کسی مفلس کا بڑھاپا - کوندا لپک رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بوندا باندی بھی ہو جاتی تھی -

خیراتی اپنے پھٹے اور ڈھیلے کوٹ کو اپنے گرد خوب کس کر لپیٹے کھانستا اور اپنے سینے کا بلغم ہوا میں اچھالتا مال روڈ پر خاموش چلا جا رہا تھا - سڑک پر اس وقت رات کے دس بجے بالکل ہی سناٹا تھا - دو چار راہ گیر اور سواریاں ایسے موسم میں اِدھر اُدھر بچتی بچاتی رینگ رہی تھیں - کسی نے اسے پکارا بھی - "رکشا ! رکشا ! ابے اوبہرے سنتا ہے یا نہیں " لیکن خیراتی مخاطب نہ ہوا - شاید اس نے سنا بھی نہیں - آج وہ اپنی دھن میں مگن تھا -

وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے آج تین روپے کمائے ہیں - اس کا سانس پھول گیا اور سینے میں درد شروع ہو گیا تو کیا ہوا ، نہ روز ایسی بوندا باندی ہو سکتی ہے اور نہ روز ایسی کمائی - اس کی گلیٹ میں چھ روپے ہیں جن میں تین روپیہ تو وہ حسب دستور بابو جی .. رکشا کے مالک " کو دے دیگا - اور بقیہ تین روپیے ______ کیوں نہ وہ عبداللہ نانبائی کے یہاں گرم گرم چٹپٹے کباب کھائے - مزہ بھی آئیگا - اور شاید اس کے سینے کا درد بھی اچھا ہو جائے ! گرم چیزیں کھانے سے تو اسے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے ______ لیکن یہ سالا ہاتھی کی جھول کی طرح کا کوٹ تو اور بھی پریشان کئے ہوئے ہے - بدن میں گرمی پہونچانے کے بجائے یہ تو اور اس کے پنکھا جھلتا ہے ______ کیوں نہ وہ پرانی منڈی سے ایک سستا گرم کوٹ خرید لائے - آخر اس بھینھڑے کوٹ میں جو اس کے

بڑان یوں ہے یہ کٹکٹاتے جاڑے کیسے کٹیں گے ـــــــــ اور پھر وہ بیمار بھی تو ہے ـــــــ کچھ دوا علاج ہی کر ڈالے - اگر پڑ گیا چارپائی پر تو پھر ـــــ لیکن یہ حکیم ڈاکٹر علاج ہی کہاں کرتے ہیں - یہ تو صرف دوا بیچنا جانتے ہیں - بیر گلے جا رہے ہیں ان تارکول کی سڑکوں پر - اگر کلو کے جوتے کی طرح کوئی ہلکا سا جوتا مل جائے ـــــــ

تلسی روڈ آگئی اور خیرالیؔ کے خیالات کا سلسلہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اس سڑک پر بڑی بڑی شاندار دکانیں، کلب اور سینما تھے - اور دن سے زیادہ رات کو دھما چوکڑی مچی رہتی - اس وقت بھی تانگے اور موٹریں دوڑ رہی تھیں - دکانوں کے اندر اور باہر برآمدوں میں لوگ چل پھر رہے تھے - کئی جگہ پیانو، ریڈیو اور گراموفون بج رہے تھے - کہیں کہیں سے قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں - مرد اور عورت کے بہت سے جوڑے اس سردی اور پانی بوندوں میں بھی سڑک پر دور اور نزدیک گھوم رہے تھے اور شاید روشنی سے زیادہ تاریکی کو تلاش کر رہے تھے - بعض مکانات سے انگریزی گانے کی بھی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ بڑی بڑی دکانوں کی سجاوٹ اور ان میں رکھی ہوئی بیش قیمت چیزوں کی جگمگاہٹ جو اس وقت رات کو بجلی کی روشنی میں دن سے بھی زیادہ خوبصورت اور بھلی معلوم ہوتی تھیں آنکھوں کو چکاچوندھ کئے دیتیں۔ عالیشان جگمگاتے ہوٹل سے بھنے ہوئے گوشت اور دوسرے مزیدار کھانوں کی خوشبوئیں نکل رہی تھیں اور دل و دماغ پر چھائی جاتی تھیں۔ میرس گارڈن سے اس وقت بھولوں کی بھیگی بھیگی مہک کا ایک طوفان اُمڈا چلا آتا تھا - خوشبوؤں کی وہ کثرت تھی کہ سانس بوجھل معلوم ہوتا۔

سڑک کے بالکل ہی نکڑ پر جوبلی ہال میں ڈانس ہو رہا تھا۔ اندر سنگ مرمر کے فرش پر خوبصورت جوڑے بیش قیمت کپڑے پہنے بلینڈ کے رومان انگیز سروں پر ناچ رہے تھے اور باہر فٹ پاتھ پر تماشبینوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ جو شیشے کے دروازوں اور مخمل کے پردوں کی آڑ سے محض ایک لمحہ کیلئے ہی اس پرستان کا منظر دیکھ لینے کی حسرت میں مرا جاتا تھا۔

کوئی کہہ رہا تھا "بجلی کی انگیٹھیاں بھی جل رہی ہیں اندر"

تماشہ دیکھنے کے شوق میں مجمع میں کسی نے کسی کے کہنی ماردی۔ اور آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ ایک منچلا ہجوم کی گرہ بڑا اور مسرت بھری گفتگو سے کچھ دور اپنا حلق پھاڑ رہا تھا۔

".. خاک میں ملتی کسی کی نوجوانی دیکھتے جاؤ"

خیراتی ان تمام ہنگامہ آرائیوں سے بے تعلق اپنے راستے چلا جا رہا تھا۔ بوندیں جو پلیٹ فارم ہی سے ہلکی ہلکی پڑنا شروع ہو گئی تھیں اب تیز ہو چلیں خیراتی نے بارش سے بچانے کیلئے اپنا کوٹ اتار کر رکشا میں رکھ دیا۔ اور اس میں سے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا نکال کر سر پر اوڑھ لیا۔ اور رکشا کی ڈھکی ہوئی چندھی لالٹین کو اور بھی ڈھانک کر ہولے ہولے دوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پھر اس کا سانس پھول گیا اور مجبوراً اسے اپنی رفتار پلیٹ فارم سے بھی کم کر دینا پڑی۔

دفعتاً ٹارچ کی تیز روشنی سے خیراتی کی آنکھیں تلملا اٹھیں اور وہ ایسا گھبرایا کہ گرتے گرتے بچا۔ سڑک کے ایک تاریک کونے سے دو پرچھائیاں جس میں کہ ایک کے پاس ٹارچ تھی نکل کر خیراتی کے سامنے آگئیں۔ ایک مرد تھا اور ایک عورت، دونوں صاحب بہادر قسم کے۔ خیراتی ٹھٹھر کر

کھڑا ہو گیا۔

مرد مخاطب ہوا "گول گھر چلو"

"بہت دیر ہو گئی ہے بابو، اڈے پر رکشا پہنچانا ہے"

"ڈیم اٹ، دیر دیر کچھ نہیں۔ ہم بخشش دیگا"

"سانس پھول رہا ہے، مر جاؤں گا بابو"

"شٹ اپ، ہم بھیگ رہا ہے پانی میں اور تم انکار کرتا ہے۔ رپورٹ کر دے گا پولیس میں" یہ کہہ کر مرد آگے بڑھا اور عورت کو سوار کر کے خود بھی رکشے پر بیٹھ گیا۔ خیراتی بچارہ ناچار رکشا چلانے لگا۔ گول گھر اور رکشا کا اڈہ بالکل ہی قریب قریب تھے۔ اور ایسی سواریاں قسمت سے ہی ملتی ہیں۔ لیکن خیراتی زیادہ دیر تک سوچ نہ سکا۔ بہت جلد اس کا سانس پھول گیا۔ اور اس کے ہاتھ پیر بے قابو ہو گئے۔ کافی دور تک تو وہ محض اپنی عادت کی بنا پر پیر چلاتا رہا۔ لیکن پھر اس کے پیروں نے جواب دے دیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ گول گھر بھی سامنے ہی آ گیا تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت ارادی سے ایک آخری کوشش اپنے آپ کو سنبھالنے کی کی لیکن اس کا رکشا بے قابو ہو کر ایک بجلی کے کھمبے سے لڑ گیا۔

خیراتی نے جب آنکھیں کھولیں، تو دیکھا کہ وہ اپنے رکشا سمیت گول گھر کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ اور ایک شخص اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"رکشا والے! ابے اُٹھ" خیراتی نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور بھونچکا ہو کر چاروں طرف گھورنے لگا۔ اسے بالکل یاد نہ تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا اور وہ کہاں ہے۔

"ڈیم فول، خود بھی گرا - اور ذرا نہ ہوتا تو ہم کو بھی گرا دیتا" - خیراتی ہمت کر کے اپنے کانپتے ہوئے پیروں پر کھڑا ہو گیا - اور رکشا کے ہینڈل کی ٹیک لگالی -

"وہ تو کہیے رکشا تیز نہ تھا ورنہ بڑی چوٹ آتی" پاس ہی کھڑی ہوئی عورت کہہ رہی تھی، اور اپنے لہجے سے بدمزاج معلوم ہوتی - "میں تو کہتی ہوں ایسے حرامزادے رکشا والوں کو پولیس کے سپرد کر دینا چاہیئے" غصے سے اس نے اپنا پیر ٹپکا -

"سلی نانسنس، اچھا بھاگو یہاں سے" مرد نے ایک روپیہ نکال کر خیراتی کی طرف پھینک دیا - اور عورت کا ہاتھ پکڑے ہوئے رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا -

"تمہارا دل بہت چھوٹا ہے - تمہیں جلدی رحم آجاتا ہے" خیراتی نے کچھ فاصلے پر عورت کو مرد سے کہتے ہوئے سنا - وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی - خیراتی نے جھک کر روپیہ اٹھا لیا - اور رکشا لیکر اڈے کی طرف بڑھ گیا - سائبان میں رکشا کھڑا کر کے بابو جی کے برآمدے میں پہنچا - وہاں بڑا جشن تھا - بہت سے لوگ جمع تھے اور کتھا ہو رہی تھی - بابو جی کے لئے عام طور سے مشہور تھا کہ وہ دن بھر سوتے اور رات بھر جاگتے ہیں - پنڈت جی بڑے جوش و خروش سے چیخ چیخ کر گیتا پڑھ رہے تھے - اور بابو جی ایک کونے میں دبکے رضائی اوڑھے حقے کے کش لگا رہے تھے - منیم جی بھی وہیں بیٹھے اونگھ رہے تھے - خیراتی نے گلیٹ سے تین روپے نکالے اور بابو جی کے سامنے منیم جی کے پاس رکھ کر چپکے سے باہر نکل آیا - پاس ہی رگھو حلوائی کی دکان پر اس نے خوب ڈٹ کر پوریاں کھائیں - الاؤ پر چلم کے بے تحاشہ

دو چار کش لگائے اور اپنی کوٹھری کی طرف روانہ ہو گیا - اب بارش تھم چکی تھی -

خیراتی اپنی کوٹھری میں جو کسی بوسے کی بل سے کچھ ہی بڑی تھی پہنچا تو اُسے اپنے پھٹے ہوئے کمبل میں نیند نہیں آئی - آج گول گھر کے سامنے گر پڑنے اور بیہوش ہو جانے کا اُسے بڑا صدمہ تھا۔ جسمانی سے زیادہ ذہنی۔ اُسے بار بار یہ خیال آتا کہ اب وہ مستقل طور سے بیمار ہو چکا ہے اور بہت جلد اپنے کام سے علٰحدہ کر دیا جائیگا - وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اتنے بڑے شہر میں بیروزگار اور پھر بیمار ہونا کیا معنی رکھتا ہے - کئی دفعہ اس نے ہاتھ پیر چلا کر اور سینہ پھلا کر اپنے آپ کو تسلی بھی دینے کی کوشش کی کہ نہیں! میں بیمار نہیں ہوں - میرے ہاتھ پیر مضبوط ہیں اور ابھی تو میں بالکل جوان ہوں۔ آخر گھسیٹے کو بھی تو کھانسی آتی ہے - اس کی عمر تو ستر پچھتر سال سے اوپر ہے۔ آخر وہ کیسے تانگہ ہانکتا ہے - اور نتھوں نے تو سیروں خون بھی منہ سے تھوک ڈالا اور تب بھی رکشا کھینچتا ہے - لیکن اس کو اطمینان نہیں ہوا - اس کے دل میں چور تھا -

یک بیک اُسے اپنی کوٹھری کے سامنے مٹی اور کوڑے کے ڈھیر پر آہٹ معلوم ہوئی - پہلے تو وہ سمجھا کہ شاید کوئی جانور ہو - لیکن جب اس نے کان لگا کر سُنا تو اسے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی اپنے ہاتھوں سے مٹی کرید رہا ہو - اُسے پہلے تو کچھ خوف معلوم ہوا اور باوجود کوشش کے وہ کھنکار نہ سکا لیکن پھر اس نے لپک کر کوٹھری کا دروازہ کھول دیا - باہر اندھیرے میں ایک عورت زمین پر بیٹھی کوئی چیز تلاش کر رہی تھی -

" کون ؟ " خیراتی نے متعجب ہو کر پوچھا -

"میں ہوں پھکن"
"یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت رات کو؟ کچھ گاڑ رہی ہے؟"
"ابھی شام کو یہیں بیٹھی فقیرے کی اماں سے جوئیں دکھا رہی تھی۔ کھونٹ میں ایک پوٹلی بندھی تھی۔ نہیں معلوم اس حرامزادی نے کھول لی یا یہیں گر پڑی۔ یا اللہ جس کسی نے لی ہو اس کے روئیں روئیں سے کوڑھ ٹپکے"
"تو کیا جلدی ہے سویرے ڈھونڈ لینا"
"سویرے ہی وہ گاؤں جانے والے ہیں اور اسی وقت آٹا لا کر ان کے لئے روٹی پکانا تھی۔ شام سے میں ڈھونڈ رہی ہوں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آنکھیں پھوٹ گئیں۔ ہزار لسبوے اس میت بیٹی فقیرے کی اماں نے چرا لی ہے۔ میں نے پوچھا تو منہ پھلا کر کہنے لگی کہ میں کیا جانوں تمہاری اشرفی۔ کہیں دے آئی ہوگی اپنے یاروں کو۔ ناس ہو جائے اس سور کی بچی کا۔ ابھی پیشاب کرنے اٹھی تو میں نے کہا لاؤ ذرا پھر دیکھ لوں۔ سویرے جس کسی کی نظر پڑے گی ہضم کر جائیگا۔"
پھکن کا شوہر دلربا ہیجڑا تھا اور وہ گا بجا کر اور اپنے پیشے کی دوسری حرکتیں کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ یہ ٹھیکرے کی منگنی اور بچپن کی شادی کا طفیل تھا۔ دلربا کے ہیجڑے ہونے کے متعلق سب ہمسایے بیچاری پھکن کو ہر وقت بناتے اور چڑاتے رہتے۔ کئی اوباش اس کی گھات میں بھی رہتے۔ اور بعض موقعوں پر اس سلسلے میں بہت کچھ تھکا فضیحتی بھی ہو چکی تھی۔ دلربا اپنی بیوی پھکن پر جان چھڑکتا تھا اور کبھی کسی کو اس کے ساتھ کوئی چھیڑ یا مذاق کرتے دیکھ پاتا تو اس قدر لڑتا اور شور و غل مچاتا کہ سارا محلہ سر پہ اٹھا لیتا۔ ہر ہمسایہ اس سے خائف رہتا۔ دلربا کو اپنی بیوی کو بلا شرکت غیرے

اپنی ملکیت ظاہر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بھکن بھی اس کا بڑا خیال رکھتی۔
خیراتی بھی کوٹھری کے دروازے سے آگے بڑھ کر بھکن کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور ہاتھ سے زمین ٹٹولنے لگا۔

"اب ہٹاؤ بھی سویرے ڈھونڈھ لینا اس وقت تو بنئے کی دکان بھی بند ہو چکی ہے۔ میں سویرے ہی اٹھکر تلاش کرلوں گا۔ اس وقت تو اندھیرے میں خود اپنا ہاتھ بھی نہیں سوجھتا۔"

بھکن مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند لمحے وہ اور خیراتی نہایت خاموشی سے پاس پاس کھڑے رہے۔ پھر دفعتاً خیراتی کا ہاتھ اس کی کرتی سے باہر کھلے ہوئے پیٹ پر مس ہو گیا۔ خیراتی کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پھر رکشا سمیت زمین پر گر رہا ہو۔ بھکن کچھ نہ بولی اور خیراتی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ ایک دفعہ پھر خیراتی کی کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا ——— جھینگروں کی چیخوں اور مینڈکوں کے بے پناہ شور کے ساتھ ہی کسی بدمزاج باپ کی طرح آسمان بھی گرج رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب بھکن اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی اپنی کوٹھری کی طرف چلی تو اس کے کھونٹ میں ایک چولی کے بجائے دو چونیاں تھیں۔

خیراتی جس کوٹھری میں رہتا وہ گونگی حویلی کا ایک جزو تھی۔ بلکہ ایک معنی میں اس کی ناجائز اولاد۔ کیونکہ دراصل جس وقت اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ گونگی حویلی سر اٹھائے آسمان سے باتیں کر رہی ہوگی اس کوٹھری کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ اس کا وجود تو گونگی حویلی کی تباہی اور بربادی کا

شرمندۂ احسان تھا - دو دیواریں کچھ اس طور سے گری تھیں کہ ان کے ملبے
کے درمیان ایک آدمی کے لیٹنے بھر کی جگہ بچ رہی تھی - اور اس غار کے منہ
پر نہیں معلوم کس لئے ایک چھوٹا سا بوسیدہ سا دروازہ اٹکا دیا تھا جس
یہ اب کوٹھری کہلاتا - خیراتی کی کوٹھری کی طرح گونگی حویلی میں بندرہ بیس اور
کوٹھریاں تھیں جو ملبے کے ڈھیروں میں زبردستی بنالی گئی تھیں - یہ کچھ
کوٹھریاں ان سینکڑوں کی ٹوٹی پھوٹی یادگار کے طور پر بھی باقی تھیں جو
گونگی حویلی کی بالائی منزلوں کی کرسیاں اونچی کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں
تاکہ ان میں نمی یا سیلن نہ پہونچ سکے - یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کوٹھریوں
میں سے بعض میں آگ جلا کر اوپر کے درجوں کو گرم کیا جاتا - پرانے زمانے
کے فن تعمیر کی یہ بھی کوئی صنعت تھی -

یہ حویلی جو گونگی حویلی کے نام سے موسوم تھی شہر کی موجودہ آبادی
سے باہر نالے کے نشیب میں اب صرف اینٹ پتھر اور مٹی کے ایک
عبرتناک ڈھیر کی صورت میں باقی رہ گئی تھی - اس کا احاطہ پانچ سو گز چوڑا
تھا - لوگ کہتے کہ کسی وقت میں نہایت شاندار، خوبصورت اور بہت
زیادہ بلند و بالا اور وسیع عمارت تھی - اس کی تعمیر پر بے دریغ روپیہ صرف
کیا گیا تھا - اس کی چھ سات منزلیں تھیں اور اس کی چوٹیوں پر طلائی کلس
میلوں سے چمکتے نظر آتے - اس حویلی میں جو کسی قلعے سے کم نہیں تھی بیشمار
ایوان، کمرے، بارہ دریاں، غلام گردشیں اور کوٹھیاں تھیں جو کہ
ہمہ وقت طرح طرح کے جھاڑ، فانوس، اطلس و کمخواب کے پردوں طلائی
اور نقرئی برتنوں، بیش قیمت قالینوں اور نادر قلمی تصاویر اور انواع انواع

کے دوسرے ساز و سامان اور چیزوں سے آراستہ و پیراستہ رہتیں۔
دُور دُور سے لوگ اس کا تماشا دیکھنے آتے اور خصوصیت کے ساتھ رات کو اس کا منظر جب کہ دیوالی کی طرح اس کی ہر کھڑکی اور دروازہ روشن ہوتا بڑا ہی دیدہ زیب معلوم ہوتا۔ چاروں طرف عمارت کے درمیان میں جو کشادہ سبزہ زار تھا اس میں بڑے سلیقے سے چمن بندی کی گئی تھی جگہ جگہ پر فوارے چھوٹتے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی نہر بھی تھی جس کے شفاف پانی میں رنگین مچھلیاں تیرتیں۔ حویلی کے بے فکر رہنے والوں کے درمیان سے ہمیشہ نغموں اور قہقہوں کی آوازیں بلند ہوتی رہتیں ——
لیکن یہ سب سُنی سُنائی باتیں تھیں جو اس کے موجودہ کرایہ دار یکے تانگے اور رکشے والے اکثر بہک کر دُہرایا کرتے اور ایک طریقے سے اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا اس بے زبان اور اُجڑی ہوئی حویلی سے معاوضہ لیا کرتے۔
حویلی کے جس صدر دروازے کے متعلق کہا جاتا کہ ایک وقت میں اس سے ہاتھی مع ہودے کے گذر جاتا منہدم ہو کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا صرف ایک اونچی سی بے ہنگم دیوار اس کے نشان قبر کے طور پہ باقی رہ گئی تھی۔ دروازے کے غائب ہو جانے سے عمارت کے تسلسل میں جو ایک بہت بڑا اور بھیانک شگاف ہو گیا تھا اس سے اندر کی ویرانی اور تباہی اس طور سے دکھائی پڑتی کہ جیسے کسی کوڑھی کی ناک اور ہونٹ سڑ کر گر گیا ہو۔ اور باہر سے اس کے دانت، زبان اور تالو دکھائی پڑ رہے ہوں۔
ساری کی ساری حویلی بالکل ہی مسمار ہو چکی تھی اور دور سے صرف ایک قبرستان معلوم ہوتی اور وہ بھی ایسا کہ جہاں مدت سے کوئی نئی قبر نہ بنی ہو۔ اس کی تباہی اور بربادی کو صحیح معنوں میں وحشت اور ویرانی کا

مرقع کہا جاسکتا - جہاں کبھی حدِ نظر تک ناز و انداز سے بچکتی ہوئی محرابیں خود اعتمادی سے سینہ تانے ہوئی دیواریں اور غرور سے سر اٹھائے ہوئے گنبد اپنی بلندی کا ڈنکا بجاتے رہے تھے وہاں اب کوڑے اور غلیظ کے پہاڑ بے گور و کفن اور سڑی ہوئی لاشوں کی طرح پڑے ہوئے تھے اور زبانِ حال سے حویلی کی گئی گذری درخشاں روایات کا مضحکہ اڑا رہے تھے - جہاں کہیں بھی بیشتر عمارت تھی اب وہاں مٹی کا ڈھیر تھا - اور اس سے پتہ چلتا کہ اگر حویلی کی تعمیر تعمیری صلاحیتوں کا ایک اچھا مظہر تھی تو اس کی موجودہ تخریب تخریبی قوتوں کا بھی ایک شاہکار تھی جو اپنی جگہ پر بالکل مختتم اور مستحکم کہی جاسکتی - روایت مشہور تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں چند ہندوستانی سورماؤں کو اس حویلی میں پناہ دی گئی تھی اور اس جرم کی پاداش میں برطانوی سامراج کی فوجوں نے اس کو اپنی توپوں کی باڑھ پہ لے لیا تھا - اور اس پر سینکڑوں گولے برسا دیئے تھے - لیکن شاید اس سے بھی فاتح فوجیوں کو اپنی بہادری اور مردانگی کی داد نہیں مل سکی تھی - اس لئے انھوں نے باقی ماندہ عمارتوں میں آگ لگا دی تھی اور اس کو بالکل ہی راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا -

گونگی حویلی کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ جب گولہ بارود اور آتش زنی سے اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی جاچکی اور اس کو بالکل ہی راکھ اور مٹی کے تودوں میں دفن کیا جا چکا تو اس کے بسنے والے سیکڑوں مرد، عورت اور بچوں میں صرف ایک عورت نہیں معلوم کیسے زندہ بچ رہی تھی لیکن حویلی کی دفعتاً تباہی اور بربادی سے وہ اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ کئی روز بعد جب اس کو ہوش آیا تو وہ گونگی اور بہری ہو چکی تھی - اور اس کا

دماغ بھی خراب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی مہینوں تک زندہ رہی لیکن وہ حویلی کے احاطہ سے باہر نہیں نکلی اور یہیں بیٹھی دن رات رو کرتی یا پھر دانت پیس پیس کر باہر سڑک پر پتھر پھینکا کرتی۔ کچھ لوگ جو از راہ ہمدردی اس کے لئے کھانے پینے کا سامان لے جاتے بتلاتے کہ اس کے ایک پیر میں گھونگرو بھی تھی۔ اور اپنے مرنے سے چند ہفتے قبل وہ ان کو بجا بجا کر بعض اوقات ناچنے بھی لگتی۔ عام طور پر مشہور تھا کہ وہ بھتنی ہو گئی ہے۔ اور لوگ کہتے کہ اب بھی رات کے سناٹے میں حویلی سے اس کے رونے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔

حویلی کی سینکڑوں اور ہزاروں دیواروں میں اب صرف چند شکستہ چھجے اور دیواریں باقی بچ رہی تھیں جو مٹی کے ڈھیروں سے اِدھر اُدھر سر نکالے بڑی کس مپرسی سے کھڑی تھیں۔ ان کا اب یہی مصرف باقی رہ گیا تھا کہ چمگادڑ اور ابابیل ان میں اپنا مسکن بنائیں اور کبھی کبھی اپنی بے ہنگم آوازیں اور چیخیں بلند کرتی رہیں۔ حویلی کی پوربی دیوار کا ایک حصہ جو کافی بلند تھا کسی مہیب انسانی ڈھانچے کی طرح کھڑا تھا۔ اس میں کھڑکیاں اور طاق بھی تھے اور سب سے اُوپر کنگرے بھی بنے تھے۔ اس کی منڈیریں جو کبھی چھاگل اور پازیب کی صداؤں سے گونجتی رہتیں اب الوؤں کیلئے وقف تھیں اور ہر اُلو کو اختیار تھا کہ رات کی بھیانک تاریکی میں اس پر کسی صدر کی طرح بیٹھ کر وقتاً فوقتاً اپنی خوفناک آواز سے اپنے اُلو ہونے کا اعلان کرتا رہے۔

حویلی کے احاطہ میں کچھ بے معنی سے ستون اور کھمبے بھی کھڑے اُونگھ رہے تھے۔ ہوا تیز چلتی تو وہ اکثر ہلتے۔ وہ شاید حویلی کی جانب سے ہاتھ اٹھائے

آسمان سے فریاد کر رہے تھے۔ ملبے، مٹی، اینٹ اور پتھر کا ایک بے پناہ اژدہام تھا۔ ہر طرف ٹیلے سے بنے ہوئے تھے اور ان پر راستہ چلنا دشوار تھا۔ پوری حویلی میں دس بارہ کوٹھریاں ایسی باقی بچ رہی تھیں جن پر کسی نہ کسی طریقے سے کہا جا سکتا کہ چھتیں موجود تھیں۔ بعض کوٹھریاں پہاڑ کے غاروں کی طرح ملبے کے ڈھیر ہی میں مٹی ہٹا کر بنا لی گئی تھیں۔ جگہ جگہ پر ٹوٹی پھوٹی لکڑی رکھ کر آسمان سے کا نا پردہ کر لیا گیا تھا۔ بعض مقامات پر ہوا میں ہلتی ہوئی دیواروں پر چھپر اٹکا لیے گئے تھے۔ کہیں صرف ٹاٹ کے پردوں پر اکتفا کی گئی تھی۔ ایک دو جگہ ٹین کے سائبان بھی نظر آتے۔ بہر نوع کسی نہ کسی طریقے سے ایک دفعہ پھر گونگی حویلی آباد ہو گئی تھی۔ اور اس کی قبرستانی فضا اور ماحول میں جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان نظر آنے لگے تھے۔ انسانوں کو زندہ رہنے کا خبط سا ہے اور وہ نا ممکن سے نا ممکن جگہ پر بھی سانس لینے کی گنجائش ڈھونڈھ ہی نکالتے ہیں۔

گونگی حویلی کو از سر نو آباد کرنے اور اس میں بیس پچیس خاندانوں کو لابسانے کا سہرا بابو جی (بابو مہابیر پرشاد۔ شہر بھر کے زیادہ تر رکشوں اور تانگوں کے مالک) کے سر تھا۔ انھوں نے یہ حویلی بلکہ اس کی زمین اور ملبہ کسی نیلام میں کوڑیوں کے مول خرید لیا تھا۔ اپنے گھوڑوں، تانگوں اور رکشوں کے لئے تو انھوں نے نیا اصطبل اور احاطہ بنوا دیا تھا۔ لیکن اپنے تانگے اور رکشے چلانے والوں کو ان کا مستقل حکم تھا کہ ان کے یہاں کام کرنے کی اولیں شرط یہی ہے کہ وہ اس حویلی ہی میں رہیں اور ان کو اس کا کرایہ ادا کریں۔ اس میں ان کی دو مصلحتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کھنڈر کا انھیں اچھا خاصا کرایہ مل جاتا۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ یہ ان کے مکان سے قریب

تھا لہٰذا اگر ضرورت پڑ جاتی تو ان غریب کرایہ داروں سے بیگار بھی لیا کرتے۔ جس وقت چاہتے کسی نہ کسی کرایہ دار کو بلا لیتے اور بغیر مزدوری اپنے یہاں کام پر لگا دیتے۔ کرایہ داروں کی کیا مجال تھی جو اس کے خلاف زبان بھی ہلا سکتے۔ رفتہ رفتہ رکشے اور تانگے والوں کے علاوہ بھی دو چار متفرق قسم کے لوگ یہاں آ بسے اور اپنی زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔ بابو جی جہاں کرایہ لینے میں سخت تھے وہاں ان میں یہ بات ضرور تھی کہ انھوں نے گونگی حویلی کے رہنے والوں کو اس کے احاطہ کے اندر مکمل حکومت خود اختیاری دے رکھی تھی۔ جس کا جس طرح سے جی چاہتا رہتا۔ وہ ہرگز مخل نہ ہوتے حویلی کے وجود کا خیال شاید ان کو صرف مہینے کی پہلی تاریخ کو آتا جب کہ ان کو کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرنا ہوتا۔ اگر کبھی "جبریہ بھرتی" کا شکار کوئی کرایہ دار اپنے رہنے کی جگہ نہ پا کر ان سے شکایت بھی کرتا تو وہ دانت نکال کر صرف یہی کہتے "بھئی میں کیا کروں؟ جگہ نہیں ہے تو جگہ بناؤ۔ آخر دوسرے پچاس ساٹھ آدمی کیسے اس احاطہ میں بسر کر رہے ہیں۔ ہوں! معلوم ہو گیا تم محنت کرنا نہیں جانتے۔ صرف شکایت کرنا جانتے ہو" بعض کرایہ دار جن کو سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی صرف حویلی کے زمین و آسمان کا کرایہ دے رہے تھے اور بابو جی کا احسان مان رہے تھے۔

خیراتی جب شروع شروع حویلی میں آیا تھا تو اس کو بھی رہنے کیلئے کوئی جگہ نہیں مل سکی تھی۔ اور بارش کے پہلے ہی چھینٹے میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ اب اسے یہاں سے بھاگنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کی قسمت کہ ان ہی دنوں میں ایک رکشے والا ایک ٹرک سے کچل کر مر گیا اور خیراتی نے جبریہ اس کی کوٹھری

پر قبضہ کرلیا - کچھ لوگ جو اپنے کو اس سے زیادہ اس کوٹھری کا مستحق سمجھتے اس کی شکایت لیکر بابو جی کے پاس گئے تھے لیکن ان کو اس قسم کے مقدمات کے فیصلے کرنے کی کہاں فرصت تھی - انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا "ذرا ذرا سی بات پر میرے پاس آکر مکھیوں کی طرح بھنبھنایا مت کرو"۔ نیم جی نے اس معاملہ پر خیراتی سے کچھ رشوت لینا چاہی تھی - لیکن اتفاق سے ایک روز ان کی بھاری بھرکم للائن عین دوپہر میں خیراتی کو سڑک پر رینگتی ہوئی مل گئیں تھیں - اس نے فوراً ان کو لاد کر گھر پہونچا دیا - اور ان کی سفارش سے نیم جی کی وعدہ کی ہوئی رشوت بھی معاف کرائی تھی -

گونگی حویلی کی ایک خاص اپنی فضا اور ماحول تھا جسکو کہ اس کے کھنڈروں اور ملبوں کے درمیان بسنے والے ہی خوب محسوس کرتے - یہاں ہر چیز گونگی تھی اور گونگے ہی کی طرح غیر فطری نظر آتی - معلوم ہوتا کہ جیسے اینٹ اور پتھر کے ڈھیروں کے نیچے حویلی کے رہنے والوں کے دل و دماغ اور روحیں بھی دب گئی ہیں - ان ڈھیروں کو دیکھتے دیکھتے ان کی آنکھیں تھک چکی تھیں، اور وہ اپنی زندگیوں کی اہمیت بھی ان ہی ڈھیروں کے برابر سمجھتے - وہ اپنی گرد وپیش کی چیزوں کو دیکھتے لیکن کچھ اس طرح کہ جیسے نہیں دیکھ رہے ہوں - وہ کبھی کسی تبدیلی کا تصور تک نہیں کرسکتے - ان کے چاروں طرف کے ڈھیروں کی طرح ان کی ذہنی کیفیات بھی جامد اور ساکت تھیں -

حویلی میں بسنے والے قریب قریب سب لوگ یکساں ہی زندگی بسر کرتے - مرد سویرے سے کام پر چلے جاتے اور رات کو نو دس بجے تک پلٹ کر نہیں آتے - بعض عورتیں بھی مزدوری کرنے یا شہر سے باہر گھاس چھیلنے چلی جاتیں - دن میں صرف چند بوڑھی عورتیں اور بچے حویلی میں باقی

رہ جاتے۔ عورتیں ایک دوسرے کی جوئیں دیکھا کرتیں یا پھر آپس میں لڑ لڑ کر ایک دوسرے کو گالی اور کوسنے دیا کریں اور بچے شور و غل مچایا کرتے اور حویلی کی مٹی کے ڈھیروں کے درمیان اپنی نئی حویلیاں بنایا کرتے۔ البتہ شام کو جب سب لوگ واپس آجاتے تو بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ کہیں بچے پیٹے جاتے، کہیں میاں بیوی میں لڑائی ہوتی، کہیں تانگے والوں میں ٹھن جاتی۔ کہیں رکشے والوں میں آستینیں چڑھ جاتیں۔ کہیں موسم کی شکایت کی جاتی، کہیں سواریوں کا رونا رویا جاتا اور کہیں آپس میں بیٹھ کر میل اور محبت کی باتیں ہوتیں۔

صحن میں جو نیم اور املی کے چار خودرو درخت تھے وہ حویلی کے کلب گھر کی حیثیت رکھتے۔ اکثر رات کو وہاں ٹولیاں جمع ہوتیں۔ اور دنیا بھر کی واہی تباہی باتیں چھڑ جاتیں۔ زیادہ تر گرانی کی فریاد کی جاتی اور سواریوں کی بے ایمانیاں یاد کر کے ان کے باپ اور دادا تک کو گالیاں دے ڈالی جاتیں۔ پولیس کی زیادتی اور زبردستی کا ماتم عموماً بڑے زور شور سے ہوتا۔ کبھی کوئی داستان چھیڑ دی جاتی۔ لیکن سب سے مقبول موضوع گفتگو ایک دوسرے کا فساد اور آپس کی شکر رنجیاں ہوتیں۔ حویلی کے بعض لوگ عموماً اور عام لوگ اکثر شراب بھی پی لیا کرتے۔ پی کر بہکنے کے لئے بھی حویلی کے یہی درخت تھے۔ یہیں ڈینگیں ہانکی جاتیں، لڑائیاں لڑی جاتیں گالیاں بکی جاتیں، زور زور سے چیخا جاتا اور بھیانک قہقہے لگائے جاتے۔ اکثر رات کے سناٹے میں حویلی کے کھنڈروں سے کچھ اس قسم کی وحشیانہ آوازیں بلند ہوتیں کہ بعض بھولے بھٹکے راہ چلنے والے جو اس طرف آ نکلتے یہی سمجھتے ہیں کہ جہنم میں ارواح خبیثہ چہلیں کر رہی ہیں یا پھر قبرستان میں بھٹکنے اد

بھتنیاں جشن منا رہے ہیں۔

رجب علی تانگے والا جو بہت معمر تھا اور حویلی کے ہمسایوں سے اپنے آپ کو مرزا صاحب کہلواتا، بڑا داستان گو تھا۔ ستر بہتر سال کی عمر تھی اور بیوی بچوں سب کو دفن کر کے اب بالکل آزاد ہو چکا تھا۔ جب کبھی اس کی طبیعت موزوں ہوتی ایسی داستان چھیڑ بیٹھتا کہ ساری حویلی سمٹ کر اس کے گرد جمع ہو جاتی۔ بڑا ہی باتونی اور چرب زبان تھا۔ نہیں معلوم اسے اتنے قصے کیسے یاد ہو گئے تھے۔ اپنے آپ کو کسی بہت بڑے زمیندار کی اولاد بتاتا۔ زیادہ تر قصے اپنے باپ دادا کی جواں مردی اور بہادری کے بیان کرتا اور واقعات کی ایک کڑی دوسری سے ایسا ملاتا کہ جبتک پورا قصہ سُن نہ لیا جاتا اس کے پاس سے اُٹھنے کا جی ہی نہیں چاہتا۔ جس دن وہ آکر چوپال میں بیٹھ جاتا بارہ ایک بجے رات تک حویلی میں رت جگا رہتا۔

کبھی کبھی لوگ دلربا کو گھیر لیتے اور وہ گھنٹوں ناچ کود کرا ور نہایت بیہودہ اور فحش گیت گا گا کر سب کا دل بہلایا کرتا۔ اس کے گیت جوان عورتیں اور لڑکیاں خصوصیت کے ساتھ بڑے شوق سے سنتیں اور خوب ہنستیں۔ بعض دفعہ گانے کی محفلیں بھی گرم ہو جاتیں۔ عورتیں ڈھولک پر گاتیں اور مرد ٹولیاں بنا کر بیٹھتے۔ خیراتی کی بھی آواز اچھی تھی اور اس کو گانے کا بڑا شوق تھا۔ جب کبھی موج میں ہوتا تانیں لگانا شروع کر دیتا۔

حویلی کے زیادہ تر رہنے والے بیوی بچوں والے تھے اور ان کی ہوسیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ لیکن اندھیری راتوں، مٹی کے ڈھیروں اور ٹوٹی ہوئی دیواروں کے پیچ در پیچ راستوں کی بدولت دل پھینک جوانوں اور عیاش بڈھوں کی حوصلہ آزمائی کے لئے بہت سے مواقع موجود تھے۔ عشق اور رومان کی کمی نہیں تھی۔

یہ ایسی وبا ہے جس کی زد سے نہ شاہی محلات محفوظ رہے ہیں نہ کھنڈرات۔ حویلی کے رہنے والوں کے درمیان ایک دوسرے کی بدچلنی اور آشنائی کی بہت سی جھوٹی اور سچی روائتیں مشہور تھیں جو کہ رفتہ رفتہ باہمی رقابت، نفرت اور بغض وعناد کی بنیادیں بن گئی تھیں۔ کلّو کہتی تھی کہ اس نے ننّھا اور چھمّن کو ایک ہی کوٹھری سے نکلتے دیکھا تھا۔ رجّو کہتا کہ اس نے دیوار کی آڑ سے شامو تانگے والے اور شیو نراین کی لڑکی کو ایک دوسرے سے چمٹتے دیکھا تھا۔ رجب علی قسمیں کھاتے کہ چھی لال کا دلربا سے تعلق تھا اور اس پر آئے دن چھی لال کی بیوی اور دلربا سے ٹھنی رہتی۔ رابشر کا کہنا تھا کہ رجب علی بابو جی کے دلال ہیں۔ اور حویلی کی جوان عورتوں کو پھسلا کر بابو جی کے پاس لیجاتے ہیں۔ اسی طرح کی بہت سی افواہیں مشہور تھیں اور ان کی اس قدر کثرت تھی کہ کوئی ایک شخص بھی بے داغ نہیں بچا تھا۔ حویلی کی جہاں ہر چیز گھناؤنی تھی وہاں اس کے حُسن اور عشق کا معیار بھی گھناؤنا تھا۔ آپس میں جب بھی لڑائی ہوتی تو بیشتر اس کا موضوع "بدچلنی" ہوتا۔ ان افواہوں سے خیراتی بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن اس کو اس کی کوئی خاص فکر نہیں تھی اور وہ حتی الامکان جھگڑے بکھیڑے سے دُور ہی رہتا۔

نوجوان لوگوں میں خیراتی کی سر برآوردہ حیثیت تھی۔ اس کی شخصیت جاذب توجہ تھی۔ لمبا قد، دُہرا جسم اور چوڑا سینہ، مردانہ حُسن کی اس میں ہر بات موجود تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ اور اگرچہ ماتھا کچھ چھوٹا تھا لیکن بڑی بڑی چمکدار آنکھوں اور ستواں ناک پر اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے سر کے بال کافی بڑھا رکھے تھے اور ان میں کڑوا تیل ڈال کر ہر وقت مانگ نکالے رہتا۔ تھوڑا سا تیل شاید وہ اپنی مونچھوں کے

بھی چھیڑ لیتا۔ کیونکہ سر کے بالوں کے ساتھ وہ بھی چمکتیں۔ بڑے بوڑھے اُسے خیال میں نہ لاتے۔ لیکن اس کے ہمعمر اپنے ہر ایک کام میں اُسے ضرور پیش پیش رکھتے۔ خیراتی حویلی میں تنہا ایک دم تھا۔ لہذا اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ بے فکری سے زندگی بسر کرتا۔ اس میں ہمدردی کا جذبہ بھی بہت زیادہ تھا۔ وقت پڑنے پر بلا کسی پس وپیش کے وہ دوسروں کے کام آجاتا اور اُس کی اسی بات نے اُسے مقبول بنا دیا تھا۔ فطرتاً وہ لڑائی دنگے سے متنفر تھا۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ آئے دن حویلی میں جو حرکتیں ہوتی رہتیں ان میں اکثر خیراتی کا بھی حصہ یا سازش ہوتی۔ لیکن عام طور سے لوگ اُسے بُرا نہیں سمجھتے۔ حویلی کے عشق و رومان میں خیراتی نے بھی مزے اڑائے تھے۔ لیکن ایک واقعہ اس کو ایسا درپیش آگیا تھا جس سے اس کی طبیعت پھیکی پڑ گئی تھی۔ اور اب وہ عموماً اس قسم کی باتوں سے علیحدہ ہی رہنے کی کوشش کرتا۔

جیالال ایک رکشے والے کے ساتھ اس کی بیوہ بہن اور یتیم بھانجی رتّی رہتی۔ یہ رتّی دہرے بدن کی موٹی لڑکی تھی۔ اور اس کے رُونئیں رونئیں سے جوانی پھوٹی نکلتی۔ جیالال چونکہ بہت ہی غریب اور کمزور انسان تھا لہذا حویلی بھر کے منچلے اس رتّی پر ڈورے ڈالنے کی فکر میں تھے اور علی الاعلان اس کو پریشان کرتے رہتے۔ وہ بیچاری اپنی جان بچاتی پھرتی۔ خیراتی کو بھی وہ اچھی لگتی لیکن وہ اس کی بیکسی دیکھ کر اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا۔ بلکہ اس کے جتنے بھی اُسے چھیڑ بیٹھتے ان کو وہ لعنت ملامت کیا کرتا۔ رتّی سے خیراتی کی نسبت کی بنیاد در اصل اس کا

جذبۂ ترحم تھا - رتی یوں تو بہت کالی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب جاذبیت اور معصومیت تھی - اور ان میں ایک ہلکی سی نمی ہمیشہ جھلکا کرتی - اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا رعب بھی تھا - جس کسی کو وہ نگاہ بھر کر دیکھ لیتی وہ کچھ مجبور سا ہو کر اس کے سامنے اپنی آنکھیں جھکانے پر مجبور ہو جاتا - خیراتی رتی کو دیکھتا تو اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی - کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کو مخاطب کرے اور اس سے اپنا حال دل بیان کر دے لیکن پھر اس کی ہمت نہیں پڑی - رتی اکثر اس کو نظر بھر کر دیکھتی اور اس وقت خیراتی کو کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں کہ " میں سب جانتی ہوں - میں سب جانتی ہوں ——— "

جاڑوں کا موسم تھا اور چونکہ اس کا رکشا کچھ بگڑا ہوا تھا - لہذا آدھے دن ہی دن سے خیراتی حویلی لوٹ آیا تھا - اس کے دل میں سمائی کہ چلو کہیں دھوپ میں لیٹ کر ہاتھ پیر سیدھے کئے جائیں - وہ حویلی کے پچھم طرف کے ڈھیروں پر چڑھنے لگا کیونکہ اس طرف زمین بہت ناہموار تھی اور کوئی نہیں رہتا - ایک طرف اسے کچھ آہٹ معلوم ہوئی - وہ اس طرف چلا تو اینٹوں کے دو ڈھیروں کے درمیان ایک دیوار کی اوٹ سے کسی کے نہانے کی آواز آئی - اس نے پہلے سوچا کہ وہ چلا جائے لیکن پھر وہ ایک ڈھیر پر چڑھ کر لیٹ گیا اور نیچے جھانکنے لگا - رتی نہا رہی تھی - خیراتی نے تمام عمر اتنا قیامت خیز منظر نہیں دیکھا تھا اور وہ اپنے آپے سے باہر ہو گیا - رتی کی اچھوتی بھرپور جوانی کسی شاداب درخت کی طرح پانی میں جھوم رہی تھی - اس کا گٹھا ہوا مضبوط جسم معلوم ہوتا کہ جیسے پتھر سے کاٹ کر بنایا گیا ہو -

خیراتی کھنکارا اور اس کو دیکھتے ہی بچاری رتی بدحواس ہو گئی اور چیخ اٹھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اپنی دھوتی میں چھپا لیا اور بڑے غصے سے خیراتی کی طرف دیکھ کر کہنے لگی :۔ "آ لینے دو آج ماما کو میں ان سے کہونگی۔ تمھیں کسی دوسرے کو تاکتے جھانکتے لاج نہیں معلوم ہوتی ؟"

خیراتی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا :۔ "معاف کر دو رتی، مجھ سے غلطی ہوئی۔"

رتی کچھ نہیں بولی تو خیراتی اس کے پاس چلا گیا۔ "رتی مجھے تم محبت ہے۔ میں تمھاری پوجا کرتا ہوں۔"

رتی نے ایک نگاہ غلط انداز سے اُسے دیکھا۔ خیراتی کے چہرہ پر اس نے سچی محبت اور خلوص دیکھا تو وہ بسیج گئی :۔ "اور اگر کوئی تم کو اور مجھکو یوں دیکھ لے تو کیا ہو ؟ یہاں حویلی میں کسی پر جھوٹ لگاتے کتنی دیر لگتی ہے ؟"

"اونھ ! دوسرے تو کہتے ہی رہتے ہیں۔ بس تم میری ہو جاؤ۔ پھر میں سب دیکھ لوں گا۔"

رتی کے چہرے پر شرم کی سُرخی دوڑ گئی اور وہ تمتما اٹھا :۔ "میرا اور تمھارا نباہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"کیوں ؟"

"تم مسلمان ہو اور میں دھوبی۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے ؟ دل مل جائیں تو پھر یہ سب ڈھکوسلے دھرے ہی رہ جاتے ہیں۔"

"اوں ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کیا کہے گی ؟"

"ارے ہم تم اس حویلی سے کیا اس شہر سے بھاگ چلیں گے۔ انجان دیس میں ہمیں کیا کوئی جانے گا۔ اس سالے رکشے کو چھوڑ کر کہیں چھوٹا موٹا روزگار کر لیں گے۔"

رتّی خاموش ہو گئی تو خیراتی نے اُسے بڑھ کر جھپٹا لیا وہ ساکت کھڑی رہی
خیراتی بولا۔" میں دیکھتا ہوں کہ حویلی کے یہ سارے بدمعاش تمہارے
پیچھے پڑے رہتے ہیں اور چیالال بابا ہر وقت اپنی افیون ہی کے نشے میں
دھت رہتے ہیں۔ کسی نے کوئی حرکت کر دی تو بس ہمیشہ کے لئے ناک
کٹ جائیگی۔"

رتّی خیراتی سے علیحدہ ہو گئی ۔" بابا کو تو خود کوئی لاج نہیں۔ وہ کہتے
ہیں کہ جا بابو جی کے یہاں نوکری کر لے نہیں تو روٹی کیسے چلے گی ——— اور
میں سنتی ہوں کہ بابو جی بڑے بدمعاش ہیں"

"اوں ہوں ، یہ کبھی نہ کرنا۔ بابو جی کے یہاں تو کبھی بھولے سے بھی
قدم نہ رکھنا ۔ یوں روپے دھیلی کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا ۔ آخر یہ دو
تین روپے روز کماتا ہوں تو کس کے لئے ؟ میرا اکیلا دم ۔ نہ آگے ناتھ نہ
پیچھے پگھا"

"اچھا اب میں چلتی ہوں ، دیر ہو گئی ہے" یہ کہکر رتی چلی گئی اور خیراتی
رتّی کو لیکر حویلی سے بھاگ نکلنے کے خیالی منصوبے بنانے لگا ۔ اس کے بعد
اکثر خیراتی اور رتّی ملتے رہے ۔ ان کے ملنے کی سب سے آسان ترکیب یہ
تھی کہ جب سہ پہر میں حویلی میں کوئی نہ ہوتا تو خیراتی واپس لوٹ آتا ۔ رفتہ رفتہ
رتی کی بھی جھجھک جاتی رہی ۔ اور وہ خیراتی سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ
وقت مقررہ پر حویلی کے پیچھے ڈھیر وں میں اس کا انتظار کرنے لگی ۔ خیراتی
اس کو دل و جان سے پیار کرتا اور جو کچھ بھی کماتا سب اسی پر صرف کر دیتا ۔
وہ ایک طرح سے اُسے اپنی گھر والی سمجھتا اور ان میں آپس میں ازدواجی تعلقات
بھی قائم ہو گئے تھے ۔ دو تین مہینے گذر گئے اور ان خفیہ ملاقاتوں کی ہی کو کانوں کان

خبر نہیں ہوئی۔ رتی کا روز بہ روز اصرار بڑھتا جاتا کہ اب کہیں بھاگ چلنا چاہیئے بھاگنے کے لیے سب سے بڑی دشواری روپے کی تھی اور طے یہ پایا کہ جب پچیس روپے جمع ہو جائیں اُسی وقت بھاگنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر کچھ پلے نہ ہوا تو اجنبی جگہ پہونچکر بڑی پریشانی اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑیگا۔

خیراتی نے بڑی عرق ریزی اور کنجوسی سے روپیئے جمع کرنا شروع کردئیے۔ اور کمانے کی فکر میں اب وہ زیادہ تر دوپہر میں حویلی پلٹ کر نہیں آتا۔ وہ جو کچھ بچاتا سب رتی کے ہاتھ میں رکھ دیتا۔ رتی اس کے روپیوں کو بڑی خوشی سے دیکھتی اور نہایت احتیاط کے ساتھ دیوار کے نیچے گڑھے میں دفن کرلی جاتی۔

کچھ دنوں کے بعد خیراتی اس بات کا فخریہ احساس کرنے لگا کہ اب پچیس[۲۵] روپیوں میں کچھ ہی کسر رہ گئی ہے لیکن ——— ایک روز بہت سویرے ساری حویلی میں یہ خبر پھیل گئی کہ رات کو رتی کہیں بھاگ گئی۔

خیراتی غم و غصہ سے پاگل سا ہوگیا۔ اُس وقت رتی اگر اس کو ملجاتی تو شاید زندہ بھی نہ چھوڑتا۔ وہ بیر پٹکتا اور دل ہی دل میں کہتا "بڑی مکار تھی حرامزادی۔ کیا گُل دیکھئی تجھ کو؟ وہ پیار و محبت کی باتیں جھوٹی ہی تھیں! روپیئے تو ہم کھپ کر جمع کئے میں۔ لے اور بھاگ گئی کسی اپنے باپ کے ساتھ" خیراتی کے حساب سے اس کے بائیس روپیئے جمع ہوچکے تھے۔ اور اس کے جیسے بےفکرے کے لئے جو اس سے پیشتر جو کچھ بھی پاتا خرچ کرڈالتا یہ رقم ایک دولت معلوم ہوتی ہے۔

رات کو اُٹھ کر خیراتی وہ جگہ دیکھنے گیا جہاں رتی اس کے سامنے گن گن کر روپیے گاڑتی جاتی۔ اس نے زمین کھودی تو اس کے سب

روپے موجود تھے بلکہ ایک اٹھنی زائد تھی جو کہ شاید رتّی نے خود جمع کی تھی۔ خیراتی کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے روپے اُٹھا کر اپنی گلیٹ میں رکھ لئے اور اس کو اسی وقت سے کامل یقین ہو گیا کہ رتّی خود نہیں بھاگی ہے بلکہ اس کو کوئی زبردستی بھگا لے گیا ہے۔ "رتی کو کون لیگیا ہے اور وہ اب کہاں ہے؟" بار بار یہ سوال اس کے سینے میں اُٹھتا اور مارے غصّے کے اس کے سارے بدن میں لرزہ سا پڑ جاتا۔ لیکن وہ اپنا رازِ دل کسی سے نہیں کہہ سکتا۔ اکثر راتوں کو وہ سوتے سوتے اُٹھ بیٹھتا اور سینے میں اس کا سانس پھنسنے سا لگتا۔

کچھ دنوں بعد نہیں معلوم کیسے یہ خبر مشہور ہو گئی کہ خود جیالال نے سّتر روپیوں پر رتّی کو دو پنجابیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ اور وہ اس کو لیکر پنجاب چلے گئے ہیں۔ رتّی کی ماں بلکتی پھرتی اور شہر میں جا جا کر اِدھر اُدھر پوچھتی پھرتی کہ کسی نے اس کی رتّی کو تو نہیں دیکھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے پاگل سمجھتے۔ جیالال اپنی بہن کو اس کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلا گیا تھا۔

خیراتی جب رتّی کے متعلق سوچتا تو اس کے سینے میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھتا۔ وہ تلملا جاتا اور ہوا میں گھونسے تان تان کر رہ جاتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ساری دنیا کو پیس کر رکھدے ———— لیکن گونگی جوتلی میں اس کے دل کی آوازیں بھی گونگی ہی تھیں۔

پیاری شمی۔

دعائیں اور بہت کچھ ——————— تمہارا
محبت نامہ ملا، آنکھوں سے لگایا، بھولی بسری باتیں پرچھائیاں بنکر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ وہ چہچہے اور وہ قہقہے، وہ سرگوشیاں اور وہ خوش فعلیاں، وہ باتیں اور وہ راتیں اور سب سے زیادہ وہ گھاتیں! بیفکری کے وہ اوقات جب امیدِ بھرے رومانوں کے خواب دیکھتے ہی دیکھتے دفورِ مسرت سے ہماری آنکھیں نم ہو جایا کرتیں اور ایک دوسرے کی قربت میں ہمارے ننھے ننھے دل دھڑکنے لگتے۔ ہم اپنی کیسی کیسی حسین تمنائیں اور رنگین آرزوئیں مستقبل سے وابستہ کئے بیٹھے تھے۔ لیکن مستقبل کبھی نہیں آتا شمی! وہ خواب و خیال کی اچھوتی دنیا حادث کی

چٹانوں کے درمیان ریزہ ریزہ ہو چکی - اُسے اب بھول ہی جائیں تو زیادہ بہتر ہے. تب شاید مجھے میری موجودہ زندگی زیادہ قابل برداشت معلوم ہونے لگے - تمھارا خط پڑھتے وقت کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے تم میرے ساتھ ہی بستر پر لیٹی چہک رہی ہو، کہہ نہیں سکتی کتنا یاد آئیں تم - بس یہی جی چاہتا کہ تم ہوتیں تو تم سے لپٹ کر خوب جی بھر کر رو لیتی - کتنی پیاری ہوتی ہیں تمھاری باتیں شمو؟ ایک ایک لفظ تیر و نشتر بنکر دل میں اُتر گیا - میں نے ایک دو دفعہ نہیں بلکہ دس بارہ دفعہ تمھارا خط پڑھا اور پھر گھنٹوں روتی رہی - اب طبیعت ذرا سنبھلی ہے تو تمھیں لکھنے کو قلم اُٹھایا ہے لیکن کیا؟ — تمھارے خط کے اس ٹکڑے پر جس میں تم نے میرے حال زار پر ہمدردی کرنے کی کوشش کی ہے پہلے تو بڑا غصہ آیا - کدھی کمینی، پاجی، بڑی آئی ہے ہمدردی کرنے والی - جا! جا!! مجھے تیری ہمدردی کی ضرورت نہیں - لیکن میں نے تمھارے خط کو بار بار پڑھا تو مجھے ماننا پڑا کہ تمھاری ہمدردی محض نیک نیتی اور خلوص دل پر مبنی ہے - یہ اس قسم کی ہمدردی نہیں ہے، جس کے خوشنما الفاظ کے پھولوں کے درمیان حقارت اور نفرت کے زہریلے بچھو چھپے ہوتے ہیں -

شمی! میں ہمدردی اور رحم کئے جانے کی حدود سے بہت دور نکل چکی ہوں - مجھے تو حقارت اور نفرت چاہئے - میں انھیں کی مستحق ہوں اور میں انھیں کی بھیک مانگتی ہوں اور انھیں سے میرے ان جذبات حقارت و نفرت کی تسکین ہوتی ہے جو میں اپنے دل میں سارے سماج کے لئے دبائے بیٹھی ہوں - اکثر راتوں میں جب سوچتے سوچتے میرا دم گھٹنے سا لگتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے کوٹھے کی چھت پر چڑھ جاؤں اور وہاں سے چیخوں -

.. کہاں ہیں مذہب کے دلال ؟ کہاں ہیں سماج کے ٹھیکیدار ؟ کہاں ہیں عصمت و عزت کے بیوپاری ؟ آؤ ! آؤ !! دیکھو میں ایک کنواری، ایک شریف خاندان کی پردہ نشین بیٹھنے والی نورنظر عنقریب ایک حرامی بچہ جننے والی ہوں! آؤ مجھ پر تھوکو، مجھ پر انگلی اٹھاؤ، مجھے ٹھوکر لگاؤ، مجھے طعنہ دو، میرا مضحکہ اڑاؤ، مجھے منہ چڑھاؤ، میرے گرد حلقہ بنا کر ناچو اور میرا ماتم کرو۔ مجھ سے جو کچھ بھی انتقام لے سکتے ہو لے لو، ایسا شکار آئے دن ہاتھ نہیں آتا، اپنے اسلحہ خانے کا کوئی بھی ہتھیار ایسا نہ چھوڑو جو مجھ پر استعمال نہ کر لو ـــــــ تاکہ جب یہ سب کچھ ہو چکے تو تم کو اطمینان ہو جائے کہ تم میری جیسی عصمت فروش اور آبرو باختہ کو قعر مذلت کی انتہائی پستی میں ڈھکیل چکے اور میرے اور میرے خاندان کی سات پشتوں تک کے کبھی سر اٹھانے کا امکان باقی نہیں رہا تو میں اپنا سینہ تان کر تم پر اور تمہارے سماج پر تھوک دوں ۔ بس میں اب بھی اپنے کئے پر نادم نہیں ہوں بلکہ خوش، بہت خوش ۔ بے انتہا مسرور ۔ میں نے جو کچھ کیا ہے بہت خوب کیا ہے اور پھر کرونگی ۔ مجھے تم دغابازوں، مکاروں اور ریاکاروں کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی کوئی فکر نہیں ہے ۔ تمہاری یہ جھوٹی اور مصنوعی خفگی دیکھ کر تو مجھے اور بھی زیادہ تم کو خفا کرنے کو جی چاہتا ہے میں نے تو اب اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے کہ تم کو خفا کروں۔ اور جب تم اپنی خفگی میں جامے سے باہر ہو جاؤ تو تم پر قہقہے لگاؤں ۔

شمی ! میرے خلاف محلے میں طعن و تشنیع شروع ہو گئے ہیں ، سارے شہر میں میرے متعلق افواہیں رینگنا شروع ہو گئی ہیں، آئے دن دو چار بڈھی کھوسٹ عورتیں تاک جھانک کر کے میرے کوٹھے پر

آکر مجھ کو دیکھ جاتی ہیں کہ میں نے اپنے گلے میں پھندا تو نہیں لگالیا۔ کہیں میں کوٹھے پر سے پھاند تو نہیں پڑی۔ کہیں میں نے اپنے اعمال کی گٹھری لے کر راہِ فرار تو نہیں اختیار کرلی! بعض مخبر تو مجھے اس طرح گھورتے ہیں جیسے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا ہی تو جائیں گے۔ وہ ڈرتے ہیں کہیں ان کی اطلاع غلط تو نہیں ہے جان کے ہاتھ سے ایسا اچھا موقع اپنی عصمت مآبی کی تشہیر اور میری تذلیل اور تحقیر کا نکل جائے سنتی ہوں کہ جب گھروں میں شریف بہو بیٹیوں کے سامنے میرا نام لیا جاتا ہے تو کنواری لڑکیاں ہٹا دی جاتی ہیں کہ کہیں میرے نام ہی کے اثر سے میرے طاعونی جراثیم ان میں سرایت نہ کر جائیں۔ شمی! وہ سب شاہ ہیں اور میں چور۔

تم کہتی ہو گی کہ میں یہ بے سر و پا داستان آج تم کو کیوں سنانے بیٹھی ہوں۔ لیکن نہیں تمہیں سننا پڑے گا۔ کبھی تم نے غور کیا ہے کہ مہذب سماج میں مرد اور عورت کے لئے عصمت مآبی کے معیار اس قدر مختلف کیوں ہیں؟ ایک ذرا سی لغزش پر ایک عورت کو تو ہمیشہ کے لئے قعرِ ذلت میں ڈھکیل دیا جائے اور ہزاروں لغزشوں پر ایک مرد کو دادِ مردانگی دی جائے! ہزاروں مرد ہیں جو فخر یہ اپنی بدمعاشیاں خود بیان کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی تم نے کسی آبرو باختہ سے آبرو باختہ عورت کو بھی اس ضمن میں لن ترانی کرتے دیکھا یا سنا ہے؟ تم کہو گی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بقائے نسل کے سلسلہ میں قدرت نے عورت پر مرد سے کہیں زیادہ اہم اور سنگین ذمہ داری عاید کی ہے۔ مرد صرف لطف اٹھاتا ہے اور عورت مصیبتیں جھیلتی ہے۔

لیکن پیاری شمّو ذرا سی بصیرت سے دیکھو تو محض اس وجہ سے کہ مرد صرف بیج جھٹکاتا ہے اور عورت اس امانت کو اپنا خون دل پلا کر اور دھرتی کا سینہ بھر کر پھل اور پھول پیدا کرتی ہے۔ سماج کو تو عورت سے اور بھی زیادہ رحمدلی سے پیش آنا چاہیئے تھا! لیکن یہاں تو معاملہ بالکل ہی اُلٹا ہے۔ ظالم کا ہاتھ کوئی نہیں پکڑتا۔ لیکن مظلوم کو دو ٹھوکریں اور لگانے کے لئے ہر کوئی تیار ہے! کہو اور بآواز بلند کہو کہ یہ بے انصافی ہے، بے ایمانی ہے، مکاری اور دغا بازی ہے۔ دنیا میں غلامی کی ابتدا عورت کی غلامی سے ہوئی۔ اور جبتک یہ غلامی کسی نہ کسی نوعیت سے باقی رہے گی دنیا کی تمام آزادیاں محض دھوکا اور سراب رہیں گی۔ مرد نے عورت کو اپنی ذاتی ملکیت بنا لیا ہے۔ اس نے تہذیب، اخلاق اور مذہب کے نام پر اُس کے لئے جو ضابطے اور اصول مقرر کر دیئے ہیں اُن کی بنیاد سراسر خودغرضی اور ظلم پر ہے۔ کہہ سکتی ہو کہ اگر جنسی معاملات میں عورت کو مرد کے مساوی آزادی دے دیجائی تو سماج میں نراج ہو جائیگا ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن خدارا یہ تو بتاؤ کہ اس نراج کی روک تھام کیلئے سراسر عورت ہی کو کیوں قربانی کا بکرا بنایا جائے۔ آخر اس کے متعلق کچھ ذمہ داری مردوں کے سر بھی تو ڈالی جانی چاہیئے۔

شمی! بچوں کی کون سی بات سب سے زیادہ دلکش اور پیاری ہوتی ہے؟ اُن کا بھولا پن، اُن کی معصومیت! لیکن اگر کوئی بچہ انگیٹھی کے دہکتے ہوئے انگارے دیکھکر یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ گھسیٹ لے "نہیں میں انھیں نہیں چھو سکتا۔ ان سے میں جل جاؤنگا اور جل جانے سے مجھے تکلیف ہوگی" تو تم اُسے کیا کہو گی؟ خواہ کچھ بھی

کہو لیکن اُسے بھولا اور معصوم نہیں کہہ سکتیں ۔ اس کی عاقبت اندیشی قابل داد ہوگی لیکن اس کی بدولت وہ اپنے بچپن کے سب سے انمول جوہر بھولے پن کو کھو بیٹھے گا ۔ عورت کو صنف لطیف کہا جاتا ہے ۔ اس کے نازک اور کمزور ہونے پر اس کو مبارکباد دی جاتی ہے ، اس کی تعریف میں قصیدے تصنیف کئے جاتے ہیں ۔ لیکن جب اس کی یہی نزاکت اور کمزوری معصیت کے بپھرے ہوئے مہیب طوفان کے مقابلے میں نزاکت اور کمزوری ثابت ہوتی ہے تو اس وقت اس کی پیٹھ پر حقارت اور نفرت کے تازیانے کیوں توڑ دیئے جاتے ہیں ؟ اس وقت اسے قوت اور طاقت کا پہاڑ کیوں تصور کر لیا جاتا ہے ؟ یاد رکھو عورت خود کبھی گناہ کی طرف نہیں بھاگتی البتہ جب گناہ اس کی طرف بڑھتا ہے تو اپنی فطری نزاکت اور کمزوری کے باعث وہ اس کے مقابلے میں بے بس اور سپرانداختہ ہو جاتی ہے ۔ اسے اس کی شخصیت کی شکست سمجھو یا اس کی نسائیت کی فتح ! پھول ہاتھ لگاتے ہی مسل جاتا ہے تو اس میں پھول کا کیا قصور ہو سکتا ہے ؟ خوشبو ایک جھونکے ہی میں منتشر ہو جاتی ہے تو اس میں خوشبو کی کیا خطا ؟ سچ پوچھو تو آج عورت دنیا کی محبوب ترین چیز محض اپنی کمزوریوں ہی کی بنا پر ہے ۔ اس سے اس کی کمزوریاں چھین لو تو خواہ وہ کچھ بھی ہو جائے عورت نہ رہے گی اور اس کی تمام تر جاذبیت اور کشش ختم ہو جائیگی ۔ شمو ! یہ فلسفے کی نکتہ سنجیاں نہیں ہیں ـــــ بلکہ یہ اُفتادہ حقیقتیں ہیں جن کی جانب سے ہم اپنی آنکھیں بند رکھنے کے عادی ہو چکے ہیں ۔

مجھ پر الزام ہے ، بڑا سنگین الزام ہے ۔ لیکن مجھے ملزم قرار دینے

والوں نے کبھی یہ بھی غور کیا کہ کیا کبھی ان کو بھی اسی طرح آزمائش کی بھٹی پر چڑھنا پڑا جس طرح کہ مجھکو ؟ منبر و محراب پر چڑھ کر تہذیب اور اخلاق کے من مانے قواعد اور ضوابط گڑھ لینا بڑا آسان ہے۔ لیکن ان کو مشعل راہ بنا کر شباب کی پُر خطر وادیوں سے گذر جانا بڑا مشکل ہے۔ معصیت کے سیلاب کا سینہ چیر کر نکل جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ عصمت پاکیزگی اور اسی طرح کے الفاظ کانوں کو بڑے پیارے اور خوش کن معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی ان کو آزمائش کی بھٹی پر تو رکھو ؟ میان کے اندر ہر تلوار تیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میدان جنگ میں ؟ ہر چمکتی چیز آزمائش کے بعد سونا ہی نہیں نکلتی ! تم نے شاید سنا ہو ایک مفکر نے کہا تھا کہ ہر عورت فطرتاً طوائف ہے۔ اور ہر مرد فطرتاً بدمعاش۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بیشتر کو طوائف و کردار پاکباز عورت اور نیک نفس مرد کے کردار کی اداکاری کرنا پڑتی ہے۔ تمہارے سماج میں اس گناہگار کے لئے تو سخت سے سخت سزائیں ہیں جو خود گناہ نہیں کرتا بلکہ جس سے اس کا ماحول جبراً گناہ کرا لیتا ہے۔ لیکن کیا تمہارے سماج میں ان پاکبازوں کے لئے بھی کوئی تعزیر ہے جن کی پاکبازی کی بنیاد ان کی نیک نفسی پر نہیں بلکہ ان کی بزدلی اور مجبوری پر قائم ہے ؟

میں نے گناہ کیا ہے۔ میرا گناہ نہ صرف مجھکو بلکہ میری بیوہ ماں اور یتیم بھائی کو سماج کی جانب سے کبھی معاف نہیں کیا جائیگا۔ لیکن کیا میرا یہ گناہ زمیندار کے اس گناہ سے بھی بدتر ہے جو وہ آئے دن اپنے کاشتکار کی ساری کمائی لوٹ کر کیا کرتا ہے ؟ کیا میرا یہ گناہ ساہوکار کے اس گناہ سے بھی ذلیل تر ہے جو وہ دن دھاڑے شریف آدمیوں کے

گھر ڈاکہ ڈال کر کیا کرتا ہے ؟ اِس چھین جھپٹ اور ظلم و تعدی کے سماج میں آخر گناہ کا معیار کیا ہے ؟ میں نے شادی سے پیشتر اپنی شادی کر کے سماج کی اجازت لئے بغیر اپنی فطرت کا تقاضا پورا کر کے گناہ کیا ہے، بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ میں سر جھکائے ہوئے ہوں تم میرا سر اُڑا دو لیکن کیا ان شریف صورت ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے لئے بھی کوئی سزا ممکن نہیں جنہوں نے ہزاروں دوشیزاؤں کو عصمت فروشی پر مجبور کر دیا، جنہوں نے ہزاروں ماؤں سے ان کے بچے قتل کروا دیئے۔ جنہوں نے انسانوں سے انسانیت، والدین سے اولاد کی ماںمتا چھین لی، جنہوں نے انسانوں کو درندہ بنا دیا، جنہوں نے علم و ہنر کو سرِ عام ذلیل اور رسوا کر دیا، جنہوں نے کیا نہیں کیا ؟ خدا سے اُس کی خدائی چھین لی۔

بولو شمی بولو ! ————

میرا گناہ یہ ہے کہ مجھے اپنے گھر کے برابر رہنے والے نوجوان کے حسین چہرے پر اُس کی بھٹکی بھٹکی کسی کو ڈھونڈتی ہوئی اُداس نظروں پر رحم آ گیا - اس لئے میری ماں سے شادی کی درخواست کی، میری ماں نے سماج کے ٹھیکیداروں سے مشورہ کیا، اُنھوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ یہ کم ذات ہے، یہ بھک منگا ہے، اس کو اپنی لڑکی ہرگز نہ دینا اور اب جب میں نے اور فیروز نے انتہائی خلوص اور محبت سے اپنی شادی آپ کر لی ہے تو انتقاماً یہ سماج کے ٹھیکیدار اپنے آپے سے باہر ہو گئے ہیں - سچ پوچھو تو میرا گناہ صرف یہ ہے کہ میں نے اپنی شادی کے وقت ان سماج کے ٹھیکیداروں کو پلاؤ اور قورمے کی رشوت نہیں دی - گلزار کی شادی بالکل جائز ہے حالانکہ وہ اپنے بدمعاش شوہر کی صورت سے

بیزار ہے۔ اس کے والدین پر کوئی بھی زنا بالجبر کی اعانت کا مقدمہ نہیں چلا سکتا کیونکہ وہ سماج کی منہ مانگی رشوت دے چکے ہیں - اور میری شادی بالکل ناجائز ہے حالانکہ وہ دو معصوم روحوں کی پاک محبت کا ایک لازوال شاہکار ہے۔ یہ ہے تمہارا سماج ! ـــــ

گلزار کا لڑکا حلالی ہوگا اگرچہ اس کی صورت دیکھکر اس کی ماں کو ہمیشہ اپنی بیکسی اور بیچارگی اور شکست یاد آجایا کریگی۔ لیکن میرا لڑکا حرامی ہوگا اگرچہ اس کی صورت دیکھکر میں ہمیشہ یاد رکھوں گی کہ کس طرح محبت کی سنہری تلوار نے رسم و رواج کے بوسیدہ اور متعفن بندھنوں کو ایک ہی وار میں کاٹ کر رکھ دیا تھا - یہ اندھا انصاف ہے اور جب تک میں خود اپنی آنکھیں پھوڑ نہ لوں میں اس کے سامنے اپنا سر جھکانے کے لئے تیار نہیں ہوں - مجھے خوشی ہوگی کہ میرا لڑکا حرامی کہلائیگا - اور اس طرح وہ سماج کا مادرزاد باغی ہوگا ـــــ اس کے دل میں تقلید و تعصب کا کوڑھ نہیں ہوگا - اس کے دماغ میں کم نظری اور تنگ بینی کا جذام نہیں ہوگا اس کی آنکھوں پر رواج اور بے انصافی کی پٹی نہیں ہوگی - اس کا دل وسیع اس کا دماغ تازہ، اور اس کی آنکھیں پُر نور ہوں گی - وہ باغی ہوگا باغی! اور وہ آزادی چاہے گا، جسم کی آزادی، فکر کی آزادی، نظر کی آزادی، وہ کھوسٹ بڑھیاں جو بیٹھکر دن برسوں سے غلام جن جن کر غلاظت کے ڈھیروں میں اضافہ کر رہی ہیں وہ اگر میرے بچہ پر ہنسیں گی تو کوئی غم نہیں - میرے بچے کے قہقہوں میں ان کی کھسیانی ہنسی دب کر رہ جائیگی۔ میرا بچہ اس جانباز فوج کا بہادر اور نڈر سپاہی ہوگا جو آج دنیا کے کونے کونے سے بڈھی کھوسٹ سماج کا سینہ چھلنی کر دینے کے لئے

اٹھاکھڑا سی ہو رہی ہے۔ شمّو! کیا تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہو؟ ۔
فیروز ایک مہینے سے کہیں غائب ہے، لیکن شمّو! وہ ضرور آئیگا ضرور
آئیگا۔ وہ مجھے اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا ہے

عجب کیا ہے جو آجائیں سہارا ابھی ٹوٹی ہے
ابھی تاروں میں کچھ کچھ روشنی معلوم ہوتی ہے

اب لکھتے لکھتے تھک چکی ہوں ۔ خدا حافظ

تمھاری نازو

رشیدہ - "کیا واقعی بلوہ ہوگیا ؟"

ملازمہ - "بی بی ! سڑک کے کونے کونے پر زخمی پڑے تڑپ رہے ہیں - شوکت بابو کے گھر میں آگ لگادی گئی ہے - ہمارے مکان کے سامنے نتھو حلوائی کی ناک کاٹ لی گئی -"

رشیدہ - "اور یہ کس بات پر ؟"

ملازمہ - "یہ لوگ تو ایسے موقعے ہی دیکھتے رہتے ہیں - آج سویرے نماز کے وقت کالے کنوئیں کی مسجد کے پاس سنکھ بجا دیا۔"

ناظمہ - "وہ ابھی تک آئے نہیں - دل دھک دھک ہو رہا ہے خدا خیر کرے -"

طاہرہ - "ارے وہ دفتر میں ہوں گے - ایسے میں کہاں آتے -"
ناظمہ - "یہاں تو جی اُلٹا جاتا ہے -"
رشیدہ - "دفتر میں تھوڑے کچھ ہو گا"
ناظمہ - "جب قصبے بھر میں موئے وحشی درندے ہی رہتے ہیں تو کیا تعجب ؟"
طاہرہ - "ارے نہیں"
سعیدہ - "وہاں پولس کا انتظام ہوگا"
(دستک ہوتی ہے - دروازہ کھولا جاتا ہے - اور بہت سی عورتیں داخل ہوتی ہیں -)
رشیدہ - (ایک کو پہچان کر) "ارے شانتی تم کہاں ؟"
شانتی - "کیا بتاؤں بہن قصبے میں بلوہ ہو رہا ہے - ہم لوگ سویرے ٹہلنے گئے تھے - نشاط گنج سے لوٹ رہے تھے کہ بلوہ ہو گیا خون کے ندی نالے بہہ رہے ہیں - یہاں تمہارا گھر نہ ہوتا تو نہ معلوم کیا ہو جاتا - بہت سے غنڈے دور سے ہم لوگوں کو دیکھ کر دوڑے - جلدی سے یہاں ڈیوڑھی میں گھس آئے"
ناظمہ - "آیئے بیٹھئے"
طاہرہ - "ارے کملا تم بھی ہو -"
کملا - "طاہرہ باجی بس پوچھئے نہیں - اس وقت جان بچ گئی - اماں بیٹھو -"
کملا کی ماں - "ارے بیٹی کیا بیٹھوں - گنگو سویرے سے گیا ہوا ہے جی لوٹا جاتا ہے -"

کملا۔ "اماں وہ آ گئے ہوں گے۔"
شانتی۔ "انسان کاہے کو ہیں بورائے کتے، بھیڑیے ہیں۔"
سعیدہ۔ "اور پھر یہ سب مذہب کے نام پر۔"
ناظمہ۔ "مذہب کا نام مفت میں بدنام کرتے ہیں۔ مذہب کا نام لے کر اپنے خون پینے اور گوشت کاٹنے کی پھراس نکالتے ہیں۔"
نرملا۔ "بلوے میں صرف بوڑھے، بچے اور عورتیں ہی مارے جاتے ہیں۔"
سعیدہ۔ "ایک زمین پر رہنے والے، ایک آسمان کے نیچے بسنے والے، ایک کھیت سے اناج کھانے والے، ایک دریا سے پانی پینے والے ذرا سے پاگل پن سے کیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو جاتے ہیں۔"
کملا۔ "اور پھر بڈھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والے بزدل، کمینے۔"
شانتی۔ "طاعون، ہیضہ، زلزلہ، قحط یہ آفتیں ہی انسان کیلئے کیا کم ہیں جو خود اپنے ہاتھوں سے نئی آفتیں لاتے ہیں۔"
رشیدہ۔ "طاعون، ہیضہ، زلزلہ، قحط یہ آفتیں کبھی فرق نہیں کرتیں کہ کون ہندو ہے کون مسلمان۔"
ناظمہ۔ "مرتے ہیں بھائیوں کی طرح لیکن جیتے ہیں دشمنوں کی طرح۔ سمجھتے ہیں بلوے سے مذہب کی بہت بڑی خدمت ہوتی ہے۔"
نرملا۔ ہر مذہب کی بڑائی اس کی رواداری میں ہے۔ یہ لوگ۔

اپنے ساتھ مذہب کا بھی منہ کالا کرتے ہیں۔"
رشیدہ:" آج تو بلوے میں شور، ہلڑ، جوش سبھی کچھ ہے لیکن کل یہی لوگ اپنے کئے پر روئیں گے۔"
شانتی ۔ یہ اپنے کئے پر کیا روئیں گے۔ ان کے یتیم بچے اور بیوائیں روئیں گی۔"
رشیدہ:" مرنا تھا تو ملک کے بچاؤ کے لئے مرتے۔ مرنا تھا تو اپنے غریب مظلوم بھائیوں کے لئے مرتے۔"
نرملا ۔" پاگلوں کو اتنی سمجھ ہوتی تو آج ملک کی یہ حالت کیوں ہوتی۔"
کملا ۔ سربازار ایک عورت کی وہ گت بنائی ہے ——— جیسے ان کی ماں بہنیں نہیں۔"
رشیدہ:" مردوں کی حماقت کا خمیازہ ہمیشہ عورتیں ہی بھرتی ہیں۔"
ناظمہ ۔" بیچاری عورت بنی ہی اسی لئے ہے۔"
شانتی ۔" اسی لئے بنی تو نہیں ہے، ہاں اپنے کو بنا لیا ہے۔"
ناظمہ ۔" وہ بیچاری کمزور کر کیا سکتی ہے؟"
شانتی ۔ کر کیا سکتی ہے؟ وہی مرد جو عورتوں کو کمزور کہتے ہیں انھوں نے انھیں کا خون چوس چوس کر اپنی زندگی پائی ہے۔"
ناظمہ ۔" لیکن وہ خود تو کمزور ہیں۔"
رشیدہ:" لیکن پھر بھی ان کی مائیں ہیں۔"
نرملا ۔" ان کے اعمال کی بڑی حد تک ان کی مائیں ذمہ دار ہیں۔ عورت لاکھ کمزور ہو وہ پھر بھی ماں ہے اور مرد لاکھ طاقتور ہو لیکن وہ پھر بھی بچہ ہے۔"

شانتی۔ "ماؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو درست کریں۔"
رشیدہ۔ "تو کیا ہم آج ہی سے یہ کام نہ شروع کرینگے۔"
شانتی۔ "(رشیدہ کے چمٹ جاتی ہے) ضرور ضرور بہن ضرور آج ہی سے۔"
سعیدہ۔ "آج ابھی۔ اگر اس وقت جبکہ بچے خون کے دریا بہا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے فرض سے کوتاہی کی تو پھر واقعی ہمیں ہرگز یہ کہنے کا حق نہ رہے گا کہ عورت مرد کی ماں ہے۔"
طاہرہ۔ "سچ مچ۔"
ناظمہ۔ "کیسے؟"
کملا۔ "جیسے بچے درست کئے جاتے ہیں۔"
(سب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ ناظمہ اور کملا کی ماں ہچکچاتی ہیں)
کملا۔ "آؤ ماں۔"
کملا کی ماں۔ "کہاں بیٹی؟ ان وحشیوں کے بیچ میں کہاں جاؤ گی؟"
کملا۔ "ماں اگر تم سنو کہ گنگو بھیا گلی میں آگ لگا رہے ہیں تو تم یوں ہی خاموش بیٹھی رہو گی۔"
نرملا۔ "بس چلو۔"
رشیدہ۔ "آج یا کبھی نہیں۔"
شانتی۔ "ہم امن اور محبت کا پرچم لیکر نکلیں گے۔"

(سب عورتیں جاتی ہیں - رشیدہ اور شانتی
آگے آگے اور کملا کی ماں اور ناظمہ
پیچھے پیچھے -)

کیا وہ انسان تھا؟

نہ معلوم کیوں یہ مہمل سا سوال میرے دماغ میں گھس آیا تھا۔ میں جب کبھی اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہمیشہ اس کا جواب نفی میں پاتا۔ وہ انسان کیسے کہا جاسکتا؟ مجھے اس خیال ہی سے نفرت ہوتی کہ اس کا جیسا متعفن اور مکروہ شخص بھی انسانوں کے زمرے میں شامل کیا جائے۔

اگر وہ انسان تھا تو پھر مرغی اور بندر بھی انسان تھے۔ محض دو ہاتھ پیروں سے تھوڑے کوئی انسان ہو جاتا ہے۔ اس کی نہ شکل و شباہت انسانوں کی سی تھی اور نہ فطرت و خصلت، بلکہ فطرت اور خصلت میں اس سے مقابلۃً کتے اور چھچھوندر انسانیت سے زیادہ قریب تھے۔

اس کے توے جیسے سیاہ چہرے پر آنکھوں کے وجود ہی کا پتہ مشکل سے چلتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی دھنسی اور چیپڑ بھری آنکھوں سے ہر وقت کیچڑ کا ایک لا متناہی دریا اس کے رخساروں پر بہا کرتا۔ اس کی ناک بہت چپٹی اور چھوٹی تھی۔ اور چہرے کی زیادہ تر سیاہی اسی کے حصے میں آئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے بد صورت ہونٹھ ہر وقت کھلے رہتے۔ کیونکہ اس کے سامنے کے چار دانت اس کے منہ سے باہر نکلے۔ اس کے زرد دانتوں سے بد بو کی لپٹیں نکلتیں جس کی وجہ سے کوئی شخص اس کے قریب کھڑے ہونے کا متحمل نہ ہو سکتا۔ اس کے سر پر وحشی اور گھنا ڈنے بالوں کا ایک بادل منڈلاتا رہتا۔ اور اس کی داڑھی کوئی خار دار گھنی جھاڑی معلوم ہوتی جو ہمیشہ اس کے منہ کی غلیظ رال سے شرابور رہتی۔

اس کے جسم میں کوڑھ تھا اور دور ہی سے کیڑے نظر آتے۔ اس کا بایاں ہاتھ سڑ کر گر چکا تھا۔ اس کے دوسرے اعضا کی مناسبت سے اس کی ٹانگیں بہت پتلی تھیں۔ وہ کھڑا ہوتا تو وہ کپکپاتیں۔ چلتے وقت وہ ڈگمگاتا ہوا چلتا۔ اور جب قدم اٹھاتا تو زمین پر پڑنے سے قبل اس کا پیر پہلے ہوا میں نصف دائرہ بناتا۔

اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ انسان ہے اور جانداروں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس میں لمبے چوڑے موٹے تازے اور سرخ و سپید انسان ہوتے ہیں۔

اس کے جاننے والے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ہی سے ایسا تھا جوانی اور بڑھاپے نے قریب قریب اس میں کوئی فرق نہیں پیدا کیا۔ اس کے

متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ چند سال پیشتر وہ کہیں سے ایک عورت بھگا لایا تھا جو خاصی جوان تھی اور جو بہت دنوں تک اس کے ساتھ رہی اور پھر اس کے تمام امراض خبیثہ سے فیضیاب ہو کر اسی کے ہاتھوں مر بھی گئی - اگر واقعی اس نے ایسا کیا تھا تو اس کے اس معجزے کے سامنے تمام سنے سنائے معجزے ، اور کرشمے ہیچ تھے - وہ اور کوئی عورت بھگا لائے ؟ یا کوئی عورت اس کے ساتھ بھاگ آئے ؟ اس کا یہ کارنامہ بھی غیر انسانی تھا اور میرے اس دعویٰ کی زبردست تائید کرتا کہ وہ انسان نہ تھا -

کیا وہ انسان تھا ؟ وہی انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے؟ اس کے عادات و اطوار تو ایک غلیظ کیڑے کو بھی شرماتے - وہ دن بھر بھیک مانگتا اور شام کو بہت سا سڑا گلا کھانا لے کر میرے مکان کے سامنے نالی کے قریب آ بیٹھتا اور پھر آدھی رات تک اپنا کھانا ہی کھایا کرتا - مجھے علم نہیں کہ وہ کب سوتا -

بھیجا پلپلا کر دینے والی گرمی اور تمازت آفتاب میں وہ تار کول کی دہکتی ہوئی سڑکوں پر اطمینان سے ننگے پیر اِدھر اُدھر گھوما کرتا - شدید سے شدید سردی کی راتوں میں جب کہ ایک انگلی بھی لحاف سے باہر نہ نکالی جا سکتی وہ اپنے برہنہ جسم پر جس پر سوائے ایک آدھ گز کی لنگوٹی کے اور کچھ نہ تھا ایک تاگے کا بھی اضافہ نہ کرتا - موسمی تغیرات سے وہ بالکل ہی غیر مانوس تھا - معلوم ہوتا جیسے وہ ان کا مذاق اڑا رہا ہو -

اگر وہ انسان تھا تو اس کو کسی عجائب خانہ میں رکھنا چاہیے تھا -

اور اس کے کٹہرے کے سامنے وکیلوں کا جیسا سائن بورڈ لگایا جانا چاہیئے تھا۔

"انسانیت کو اس حد تک ذلیل کیا جا سکتا ہے۔" یا "ہمارا سماج اپنے افراد سے اس حد تک غیر متعلق ہے۔" "موجودہ سرمایہ دارانہ سماج کی فتوحات کے لئے اُس کا وجود ایک جیتا جاگتا تمغہ یا شیلڈ تھا"

نہیں معلوم کیوں وہ بھک منگوں کی ٹولی میں بہت زیادہ مقبول تھا شاید ان کے فن میں وہ کامل یا۔ رہبر کی حیثیت رکھتا ــــ اگر بھک منگوں کو ووٹ دینے اور اپنا علٰحدہ نمائندہ منتخب کرنے کا حق حاصل ہوتا تو وہ ضرور اس کو اسمبلی یا کونسل کا ممبر بنا دیتے ہمیشہ ایک نہ ایک فقیر اس کی مصاحبت میں حاضر رہتا۔ وہ ان سے بڑے حکیمانہ اور بزرگانہ لہجے میں گفتگو کرتا۔ اس کی آواز میں منمناہٹ کا ایک ایسا ہارمونیم بجتا کہ بہت کم ہی لوگ اس کی بات سمجھ پاتے۔

ایک روز شام کو میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور خیالات کی کشمکش اور تنہائی کی وجہ سے کچھ مکدر سا ہو گیا تھا۔ میرے کوٹھے کے بالکل سامنے "وہ انسان" چند فقیروں کے ساتھ بیٹھا ہنس بول رہا تھا۔ وہ ہنستا کبھی نہ تھا صرف ہنسنے کے موقع پر اپنا غلیظ منہ پھاڑ دیتا۔ مجھے نہیں معلوم کیوں اس پر غصہ آ رہا تھا اور اس سے ایک غیر ارادی بغض معلوم ہوتا۔ اس بہتیں جھپٹ کے سماج میں جہاں ہر شخص کا مفاد دوسرے شخص کے منافی ہے۔ اور جہاں کشمکش حیات میں ہمیشہ نفسی نفسی پڑی رہتی ہے اس قسم کا جذبہ چنداں تعجب انگیز بھی نہیں،

مجھے آپ ہی آپ اس کو چھیڑنے کو جی چاہا۔ کئی روز پیشتر میری ایک گھڑی کھو گئی تھی۔ میں نیچے اُتر کر اس کے پاس گیا اور اس سے ہٹ کر کہا۔ "تم میری گھڑی چُرا لائے ہو؟"

بالکل خلاف توقع اس نے عجیب نفرت اور حقارت سے مجھے دیکھا اور پھر اپنا مُنہ پھیر لیا۔ جیسے میں کوئی پاگل ہوں۔ اس کی آنکھوں کی چمک سے میں دنگ رہ گیا ———— غربت، بیکسی اور لاچارگی کے سنوں راکھ کے ڈھیر میں خود داری کی ایک چنگاری سُلگ رہی تھی ـــ !!

"وہ بھی انسان ہے، وہ بھی انسان ہے" میں بڑبڑاتا ہوا اپنے کوٹھے پر بھاگا۔

کاش کہ وہ چنگاری بھڑک کر ایک شعلہ ہو جاتی جو سارے عالم کو محیط کر لیتا ـــ

دسمبر کی سنسان تاریک رات تھی، پانی برس کر تھم چکا تھا۔ لیکن سیاہ مہیب بادلوں کا غصہ کم نہ ہوا تھا اور وہ اب بھی گرج رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ کلیجہ ہلائے دیتے۔ ریزیڈنسی کے کھنڈر بیکسی سے سر بہ گریباں کھڑے تھے۔ نالے کی گڑگڑاہٹ سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ لیکن کبھی کبھی ہوا کا کوئی بیباک جھونکا چھتر منزل کلب کا کوئی قہقہہ چرالاتا۔ سامنے شکستہ مینارے پر جھنڈے کا ستون عجیب ساکت کھڑا تھا جیسے اس کے بھی ضمیر ہو۔ اس کے پاس ہی ایک اُلو بیٹھا ماضی کی جبروت اور عظمت کا ماتم کر رہا تھا۔

ریزیڈنسی کی ویران بستی دیکھ کر میرے دل میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ یہ سرزمین مادرِ وطن کے کتنے سپوتوں کے خون کی ضامن ہے۔

یہاں ایک شعلہ اٹھا تھا غلامی کی زنجیریں توڑ دینے کے لئے۔ یہاں نہ خاکسار تھے نہ جہابیر دل، یہاں ہندوستانی تھے اور صرف ہندوستانی جو ہندوستان کے لئے لڑ رہے تھے۔ یہاں پہلی مشعل تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لئے روشن کی گئی۔ یہاں عدم تشدد اور چرخے کا فلسفہ نہ تھا۔ یہاں مردانہ وار تلوار کا جواب تلوار تھا۔

میں بیشتر کے کالر اونچے کئے اور لوٹی کو کانوں تک کھینچتے ہوئے تیزی سے جا رہا تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور مجھے اب گھر پہونچ جانا چاہیئے تھا۔ پچاس قدم کے فاصلے سے مجھے رزیڈنسی کے دروازے پر ایک پرچھائیں نظر پڑی۔ میں قدم بڑھائے آگے چلا گیا۔ بجلی کے لیمپ کی روشنی میں وہ پرچھائیں ایک عورت بن گئی اور ہوا میں اس کی ساری کا پلو اڑا۔ میرے قدم اور تیز ہو گئے اور چند ہی لمحوں میں میں اس کے قریب آ گیا۔ ایک دبلی پتلی جوان عورت جس کی جوانی اپنی فیاضی سے بڑھاپے کو دعوت دے رہی تھی۔ مجھ کو دیکھ کر مسکرا دی۔ میں رک گیا۔ وہ پہلے ہی سے ٹھہر چکی تھی۔

- آپ کون ہیں؟ اس وقت کہاں؟" اس سنسان فضا میں میں بڑی جلدی سے خدائی فوجدار بن گیا۔

" آپ مجھے گولہ گنج پہونچا سکتے ہیں" اس نے کہا۔

" کہاں جایئےگا آپ؟" میں نے پوچھا۔

" مکان قریب ہی ہے یہاں سے۔ آپ کو تکلیف ہوگی؟"

اس کے لہجے میں ناز بھی تھا اور نیاز بھی۔

" آیئے! میں اسی طرف جا رہا ہوں۔ لیکن آپکو دیر کیسے ہو گئی۔"

"ڈیر! دیر تو نہیں ہوئی ابھی۔ آٹھ بجے ہیں۔" اس کا لہجہ عجیب رازدارانہ تھا۔

میں اپنے حساب پہلے ہی سے بہت کچھ سمجھ چکا تھا لیکن میں اس کے منہ سے کہلوانا چاہتا تھا۔ بعض اوقات کی ہمدردی کس قدر جذبۂ انتقام سے پُر ہوتی ہے۔ میں نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں از سرِ نو جرح شروع کی۔

"آپ روز جاتی ہیں ٹہلنے۔"

"جی ہاں، کبھی کبھی۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ ساتھ آئیں تھیں کسی کے؟"

اس سوال پر وہ مسکرا دی۔ نہ معلوم غیرت سے اور نہ معلوم میرے طفلانہ اشتیاق پر۔ میں تاریکی میں دیکھ نہ سکا۔

"آپ کو بہت دیر ہو گئی۔ سردی لگ رہی ہے؟" میں نے محسوس کیا کہ وہ کانپ رہی ہے۔ ابھی تک میں اپنی تفتیش میں اس قدر محو تھا کہ میں نے خیال بھی نہ کیا کہ ٹھنڈی ہوا کے تیر و نشتر چل رہے ہیں اور وہ صرف ساری اور ایک ہلکا سا سوئٹر پہنے ہوئے ہے۔

"جی ہاں بڑی تیز ہوا ہے!"

"آپ میرا جیسٹر پہن سکتی ہیں۔"

"جی نہیں اب مکان قریب آ گیا ہے۔" اس نے کہا۔

میری خود غرضی نے یہ گوارا نہ کیا کہ میں کہ میں اپنا جیسٹر ایک بازاری عورت کو دیدیتا۔ میں نے صرف رسمی طور پر پوچھ لینا ہی اپنا بہت بڑا ایثار سمجھا۔

کیا کرتی ہیں آپ؟ یہ سوال کر کے مجھے پچھتاوا ہوا۔ وہ اچھی خاصی

سمجھدار معلوم ہوتی۔

"کچھ نہیں!" اس نے اپنے جواب سے میرے سوال کو بہت کچھ معصوم کر دیا۔

سڑک سے وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ اب آگے وہ تھی اور پیچھے میں۔ بل کھاتی ہوئی بہت سی سنسان گلیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ ایک چھوٹے سے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے گھوم کر مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ میں اب واپس جانا چاہتا۔ میرا گھر قریب ہی تھا اور میں اس مذاق کو یہیں تک رکھنا چاہتا۔ شاید وہ میرے ارادے کو بھانپ گئی۔

"آپ اندر آ سکتے ہیں!" اس نے کنڈی کھٹکھٹائی۔

قبل اس کے کہ میں کوئی جواب دوں دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں دھیمی لالٹین جل رہی تھی اور آٹھ دس سال کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔

"اماں" لڑکی نے کہا۔ معلوم ہوتا جیسے وہ بڑی دیر سے منتظر تھی۔

"آئیے!" عورت نے مجھ سے کہا اور میں غیر ارادی طور پر اندر چلا گیا۔ لڑکی نے اندر سے کنڈی چڑھائی اور اپنی بچھی ہوئی رضائی میں منہ لپیٹ کر ایک کونے میں پڑ رہی۔ یہ سب باتیں کچھ اس سرعت سے ہوئیں کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ معلوم ہوتا جیسے کوئی ڈرامہ ہے اور ہر چیز اپنے وقت سے ادا ہو رہی ہے۔

"میں جانا چاہتا ہوں اب" میں گھبرا گیا تھا۔

عورت نے خوب گھور کر مجھے تعجب سے دیکھا۔ اس کی سیاہ

فلاکت زدہ آنکھوں میں غربت معصیت سے گلے مل رہی تھی۔

"دیر ہو رہی ہے مجھے!" میں بڑی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔

عورت نے مجھے نہایت غصے سے دیکھا۔ وہ اپنی چارپائی پہ بستر درست کر رہی تھی۔ میں اس کی نظر کی تاب نہ لا سکا۔ میری آنکھیں نیچی ہو گئیں۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بستر پر پھینک دیا۔ عورت کی طرف بغیر دیکھے ہوئے مڑا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کلبلا کر لڑکی کسی جاپانی گڑیا کی طرح اٹھ بیٹھی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میں دروازے کے پاس بہت دیر کھڑا رہا۔

"پانچ روپے۔" ماں نے دفور مسرت سے کہا۔

"اب وہ نہیں آئیگا ماں!" لڑکی نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"اس نے تو لالٹین بھی نہیں بجھائی ماں!" لڑکی ہنس رہی تھی۔

"وہ پاگل تھا پاگل!" ماں بیٹی دونوں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے بھاگا —

۲
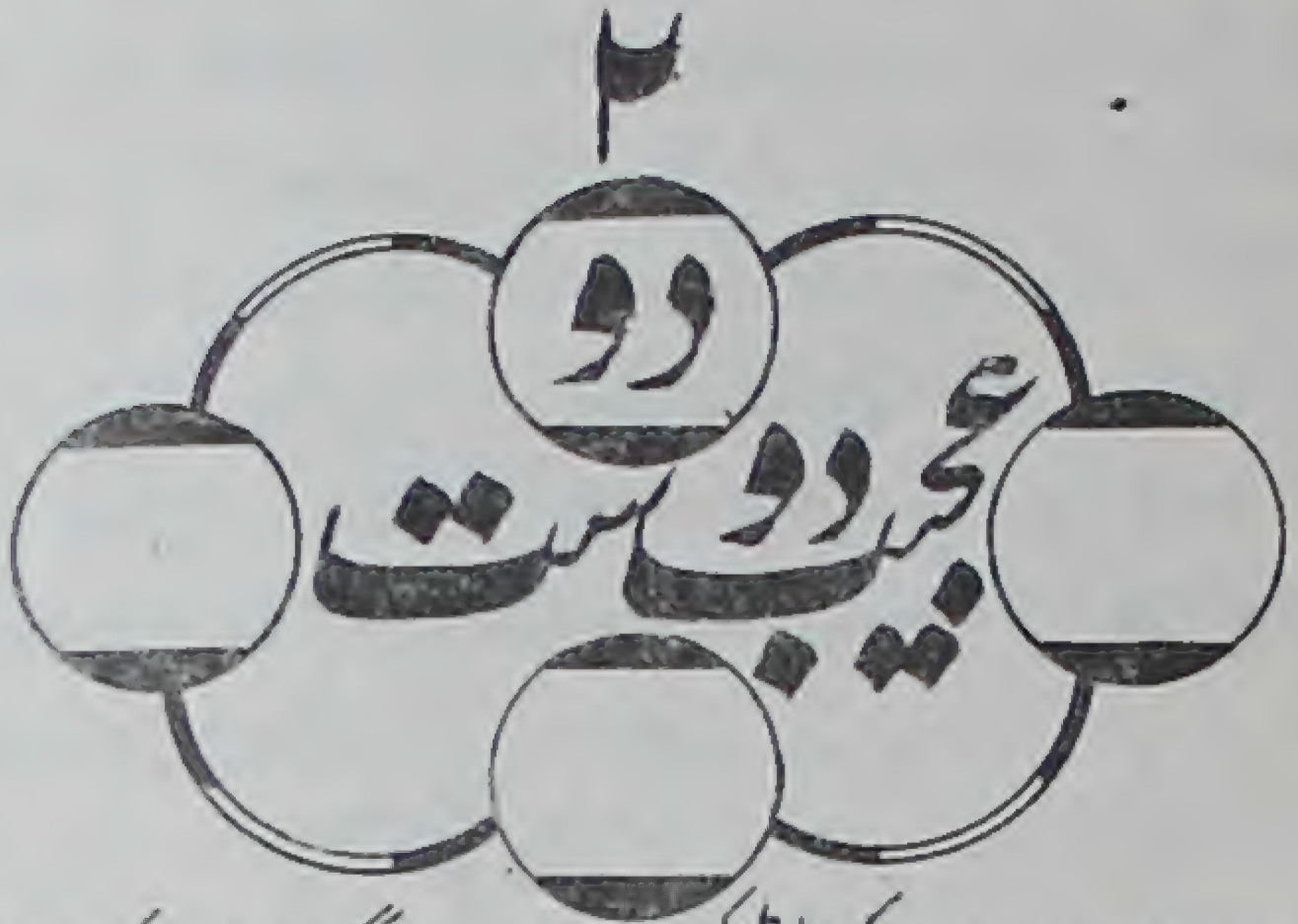
ہر دم جاری اور ساری، کبھی میٹھی کبھی کھاری۔ یہ زندگی جو پل میں ساکن پل میں طوفان ابھی بوڑھی ابھی جوان دکھائی پڑتی ہے۔ اپنی تمام بیوفائیوں اور بے رحمیوں کے باوجود بڑی ہی دیدہ زیب اور دلفریب ہے۔ اس کی سختیاں اور محرومیاں بے حساب سہی لیکن ان کو برداشت کرنے کے لئے سہارے اور معاونے بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ بچچا غالب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ع

"بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے"

بس جب اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو جہاں اپنی خواہش کے بموجب اس کو کامیاب اور کامراں نہیں دیکھتا وہاں اپنی حدود کے مدِ نظر وہ سراسر حرفِ غلط یا سعیِ رائیگاں بھی محسوس نہیں ہوتی۔

میرے حصے کی تلخیوں اور مایوسیوں کی بہت بڑی تلافی میرے بعض دوستوں نے کی ہے۔ جنھوں نے اپنی اور میری بہت سی الجھنوں اور دشواریوں کے

باوجود کبھی اپنی شرافت، رفاقت اور لیاقت سے اور زیادہ تر اپنی حماقت سے میری زندگی کو نہ صرف گوارا اور قابل برداشت بلکہ پُرکیف اور دلچسپ بنائے رکھا ہے۔

جیسے جیسے کاروانِ حیات آگے بڑھتا جاتا ہے جبھی زیست زیادہ تیز اور گھمسان ہوتی جاتی ہے اور اس بھاگ دوڑ اور چھین جھپٹ میں کچھ دوست تو قیدِ حیات اور بندِ غم ہی سے آزاد ہو گئے۔ کچھ دوسرے میدانوں میں اتنی دور جا پڑے کہ صورتِ جاناں بھول گئے کا مضمون در پیش ہو گیا۔ البتہ کچھ جانی پہچانی صورتیں آس پاس ضرور دکھائی پڑتی ہیں۔ اور اگرچہ ان کیلئے بھی نہ تم خالی نہ ہم خالی والی مجبوری ہے۔ تاہم وہ بہت غنیمت ہیں اور موسم خزاں میں پتوں اور ڈالیوں کے نیچے ڈھکے چھپے پھولوں کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

خزاں کے جور سے ہر چند خوار ہیں ہم لوگ
مگر امانتِ فصلِ بہار ہیں ہم لوگ

میرا اپنے دوستوں کا ایک نگارخانہ ہے جہاں تخیل نے پرانی یادوں کی مدد سے ان کی چلتی پھرتی، ہنستی بولتی تصویریں محفوظ کر رکھی ہیں۔ میں اکثر اپنی زندگی کی یکسانیوں سے گھبرا کر اس صفت کے سہانے گھر میں جس کا میں تنہا مالک اور تماشائی ہوں گھس جاتا ہوں۔ چلئے آج اس کی کچھ تصویروں کی ہلکی سی جھلک آپکو بھی دکھاؤں۔

میرے اور میرے ساتھ پڑھنے والے رشتے کے بھائیوں کے ایک اُستاد نما دوست تھے جنھیں خبردار خاں کہہ لیجئے۔ یہ رکھے تو گئے تھے ہم لوگوں کے اتالیق بنا کر لیکن ہم لوگوں نے انھیں فلمی دھنیں گانا اور سینما دیکھنا وغیرہ سکھا کر اپنا ایک بے تکلف دوست بنا لیا تھا۔ لیکن اپنی اس تمام وسیع مشرب تربیت کے باوجود انھیں سماج کی معرفت نصیب ہوئی تھی خبردار خاں میں یہ ایک بڑا عیب باقی رہ گیا تھا کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے ہم سب اپنے شاگردوں کو تنبیہیں بہت کرتے، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو

اپنی ناک مت چھوؤ، ڈی سوزا کو دیکھ کر ہنسو مت، بولو مت،

-اور جب ہمارا کوئی بزرگ سامنے ہوتا تو یہ تنبیہہ کرنے والا دورا ان پر اور زیادہ شدت اور حدت سے پڑ جاتا۔ ہم ساتھیوں یعنی ان کے شاگردوں کی ہمیشہ کوشش یہی رہتی کہ جو نصیحتیں اور فضیحتیں خبردار خاں ہم لوگوں کو کرتے رہتے ہیں ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ خود ہی پکڑے جائیں۔ وہ ہم لوگوں سے کہتے کہ سڑک پر ہم لوگ ایک قطار میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اٹھائیں۔ اور ہم لوگوں نے انھیں اسی طرح چلاتے ہوئے دھوکا دیکر ایک گڈھے بیچ الابازی کھلوادی تھی۔ مختصر یہ کہ آئے دن اسی قسم کے لطیفے در پیش رہتے۔ خبردار خاں بیچارے خود بے خبری کا شکار ہو کر اپنے تماشائیوں کے لئے دیوار قہقہہ بن جاتے۔ مگر وہ اپنی تنبیہہ کرنے والی عادت سے باز نہ آتے۔

ایک دفعہ کچھ بزرگوں کے ساتھ ہم ان کے شاگرد اور خبردار خاں ایک بارات کی معیت میں ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ٹرین اس روز آسیب زدہ معلوم ہوتی اور درمیانی اسٹیشنوں پر رک رک کر چلنا بھول جاتی۔ ہم لڑکے کب نچلے بیٹھنے والے تھے ٹرین کے رکتے ہی پلیٹ فارم پر اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگتے۔ خبردار خاں کو بزرگوں کے سامنے اپنی خیر خواہی کے جوہر دکھانے کا یہ نادر موقع تھا۔ وہ ہم لوگوں کے پاس یہ کہتے ہوئے دوڑتے پھرتے "دیکھو گاڑی چلدے گی اور تم رہ جاؤ گے" اور پھر ایک ایسے اسٹیشن سے جہاں ٹرین زیادہ دیر تک رکی تھی اور ہم لوگ زیادہ دور تک پھیل گئے تھے۔ جب ٹرین روانہ ہوئی تو ہم سب تو دوڑ کر اسکے اندر پہونچ گئے تھے البتہ خبردار خاں پلیٹ فارم ہی پر اپنی زندگی کی سب سے تیز چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اور اگر اسٹیشن ماسٹر اور دوسرے ریلوے کے اہلکار دوڑ کر ان کو نرغے میں لیکر پکڑ نہ لیتے تو وہ یقیناً شہید ہو کر دوسرے روز ہم لوگوں سے چار چوٹ کی لڑائی لڑنے کے بجائے اخبار کے کالم کی زینت بن جاتے۔

بہ تفصیل بتانا غیر ضروری ہے کہ بیچارے خبردار خاں جیسے محتاط انسان پر تین جرموں یعنی اقدام خودکشی، سرکاری اہلکاروں سے دھول دھپا اور بے ٹکٹ پکڑے جانے کے سلسلہ میں جو مقدمہ چلا اس کے متعلق بجائے اُن کے ہم ان کے شاگردوں نے اُن کو بہت سی نصیحتیں کیں۔

ایک ہمارے دوست تھے جن کو بگاڑ درام کہہ لیجئے۔ وہ پہلے ہمارے والد کے دوست تھے اور ان کے انتقال کے بعد ہمکو ایک طرح سے اُن کے ترکے میں ملے تھے۔ پڑھے لکھے تو خیر وہ واجبی ہی واجبی تھے اور انگریزی زبان سے تو بالکل ہی نابلد تھے۔ لیکن اپنی ہمہ دانی کا رعب جھاڑنے کیلئے انھیں نئے نئے الفاظ بولنے کا خبط تھا۔ کوئی نیا لفظ سُن پاتے تو خواہ اس کے معنی مطلب ٹھیک سے سمجھے ہوں یا نہیں اس کو استعمال کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے اور اس بیجا استعمال کے لئے وہ کسی موقع اور محل کے قائل نہ تھے بلکہ ان کو اس زعم میں کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" وہ خود پیدا کرلیا کرتے۔ خصوصیت کے ساتھ انگریزی الفاظ کو توڑ پھوڑ کر غلط تلفظ سے اور معنی و مطلب سے بے نیاز ہوکر وہ اس سینہ زوری سے بولتے کہ اگر اُن کے جیسے دو چار بولنے والے اور ہوتے تو غالبًا سنہ ۱۹۴۷ء سے کہیں پہلے انگریز ہندوستان چھوڑکر چلے گئے ہوتے۔

خیر غلط الفاظ اور بے محل بولنے تک کو برداشت کیا جاسکتا تھا کیونکہ ابھی تک کسی حکومت نے حماقت پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ بگاڑ درام اپنی اس حماقت پر کسی کو ہنستے دیکھتے تو آپے سے باہر ہوجاتے۔ اکثر دوستوں کی محفل میں مذاق کے دوران دفعتًا ان کی گرجدار آواز گونجتی "آپ اپنے کو بڑا برقع سمجھتے ہیں۔ (برقع سے مراد بقراط) اور میرا مخول اڑاتے ہیں۔ ایک ہی گھونسے میں آپ کا ماحول بگاڑ کر نہ رکھدوں تو میری اس مونچھ کو میری پونچھ تصور کیجئے گا۔"

الفاظ بھی بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ وہ بسا اوقات بغیر تک اور تال کے بولے جانے پر بھی اپنے کچھ معنی اور مطلب پیدا ہی کر لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ مرزا گوگے صاحب کے کتے نے خود ان کا خرگوش کا بچہ مار ڈالا جو وہ ایک روز قبل ہی نخاس سے لائے تھے۔ محلے بھر نے مرزا صاحب سے تعزیت کی۔ لیکن ہمارے بگاڑو رام نے ایک عجیب ہی بات کہہ کر مرزا صاحب کا غم غلط کر دیا۔ بولے "آپ کا کتا ابھی خرگوش سے مانوس نہیں ہوا تھا اسی وجہ سے اُس نے اسے مار ڈالا"

بگاڑو رام مرزا صاحب کو اپنا کلاس فیلو کہتے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ دونوں دوسرے درجے میں ایک ساتھ ہی فیل ہوئے تھے۔

ایک دفعہ آواز دینے پر گھر کے اندر سے بگاڑو رام محض تہمد باندھے نکل آئے۔ فرمایا "بس گھر پر یوں ہی خانہ بدوش رہتا ہوں"

ایک دعوت میں جس میں بگاڑو رام بھی منتظم تھے ترکاریاں پہلے آگئیں اور پوریاں آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ اتفاق سے اسی وقت بجلی کی روشنی بھی جاتی رہی۔ اچانک ہمارے دوست کی آواز گونجی "دیکھو بھائیو ترکاریاں منہ زبانی مت کھائیو ورنہ پوریاں کوری رہ جائیں گی"

ہمارے دوست اپنی بگڑی زبان کی بدولت ایک چلتا پھرتا لطیفہ تھے۔ لوگ ان کی بے تکی باتیں سنکر خوش ہوتے لیکن ایک دفعہ ان کی اس حرکت سے ایک بڑی خوفناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی اور وہ کوتوالی یا اسپتال بھیجے جانے سے صرف بال بال ہی بچے تھے۔

ہوا یہ کہ بگاڑو رام اپنی بیوی کو اپنے فیملی ڈاکٹر (جن کو وہ فالتو ڈاکٹر کہتے) کے مشورے سے ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھانے گئے۔ لیڈی ڈاکٹر کی تشخیص ایک

پرچے پر لکھا کر وہ جب ڈاکٹر کے مطب پہونچے تو یوں گویا ہوئے " لیڈی صاحب نے کہا ہے کہ اگر آپ کو ان کی رائے سے اختلاف ہوگا تو وہ آپ سے فل پوائنٹ سے باتیں کرینگی " ڈاکٹر یہ سنتے ہی چراغ پا ہو گیا۔ اُس نے بگاڑ درام سے بار بار پوچھا اور اُنھوں نے ہر بار یہی جواب دیا کہ وہ آپ سے فل بوٹ سے باتیں کرینگی ۔ ڈاکٹر نے آپے سے باہر ہو کر لیڈی ڈاکٹر کو فون کیا ۔ پہلے تو دونوں طرف سے کافی گرما گرمی رہی اور پھر پتہ چلا کہ بگاڑ درام ٹیلیفون کو فل بوٹ کہہ رہے تھے ؏

" ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے "

بتائیے اب ایسے دوست کہاں ملتے ہیں ؟ زندگی میں ایسے دوست نہ ملتے تو وہ کتنی بے کیف ہوتی ۔

لاکھ دستورِ وفا دنیا سے اٹھتا جائے ہے
آج بھی لیکن کوئی انساں نظر آجائے ہے

جن بچھڑے ہوئے عزیزوں سے خاص محبت اور انسیت بلکہ روح کی وابستگی ہوتی ہے، ان کی یاد بعض اوقات بہت غیر متوقع اور عجیب انداز سے آجاتی اور دل کو بڑی ہی بے رحمی سے تڑپا دیتی ہے۔ چند روز ہوئے میں غالب کے فارسی دیوان کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اتفاق سے یہ شعر سامنے آگیا۔

نظر فروز ادا ہا بدشمن ارزانی
بمن سپار اگر داغ از سینہ تابے ہست

بہت پسند آیا۔ بار بار پڑھا اور جھوم جھوم اٹھا۔ دفعتاً خیال آیا کہ ابھی اسی وقت جاکر یہ شعر اپنے اسرار بھائی کو سناؤں گا۔ تو وہ بہت خوش ہوں گے اور اس کی قرار واقعی داد دیں گے۔ میں ان کے پاس جانے کے لئے کمرے سے باہر

نکل آیا کہ اچانک دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسرار بھائی کہاں؟ ان کی وفات کو تو کئی مہینے بیت چکے۔ میں کمرے میں واپس چلا گیا۔ دیوان جو ہاتھ میں تھا بے دلی سے میز پر ڈال دیا اور خود بستر پر جامد و ساکت بیٹھ گیا۔ اسرار بھائی جا چکے! وہ اب کبھی نہیں ملیں گے! میں اب کسی کو اپنے پسندیدہ اشعار اور افسانے نہیں سنا پاؤں گا۔! مجھے اب کوئی پرچوں پر لکھ کر اپنے مرغوب اشعار نہیں بھیجے گا۔! میرے پڑھنے کے لئے کوئی بھی رسالے اور کتابیں بٹور کر نہیں رکھے گا۔! میرے ساتھ کوئی بھی غالب اور اقبال پر اس بے تکلفی سے تبادلۂ خیال نہیں کرے گا۔! میرا اس تپاک اور محبت سے کوئی بھی استقبال نہیں کرے گا۔! جب شمع ہی بجھ چکی تو اب محفل کہاں؟ جب ساقی ہی نہیں تو پھر میخانے کا کیا ذکر؟ ....

.... اور میں اسرار بھائی کی یادیں جو امنڈی ہی چلی آتیں، تازہ کر کے بڑی بے بسی کے ساتھ غم واندوہ کے بے تہا سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ کتنی جابر اور ظالم ہوتی ہے وہ موت جو کسی ایک کی جان لینے کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے دوسروں کی بھی خوشیاں اور دلچسپیاں چھین لیتی ہے۔ اسرار بھائی اگرچہ ایک درویش صفت اور گوشہ نشین انسان تھے۔ لیکن اپنے حسنِ اخلاق اور پر خلوص محبت کی بنا پر وہ اپنے سے قریب تر لوگوں کے لئے ایک ادارہ تھے۔ ان کی موت ایک فردِ واحد کی نہیں ایک ادارے کی موت ہے۔ ؎

کہنے کو ایک مشت پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

آج کی مشینی اور ہنگامی دور میں جب کسی انسان کی عظمت محض اسکی اخباری شہرت سے ناپی جاتی ہے۔ اس کے ذاتی اوصاف اور اقدار کو بیشتر نظر انداز کر دیا

جاتا ہے۔ ہماری آنکھیں کارنامے ڈھونڈتی ہیں۔ اور انسان کو کم تلاش کرتی ہیں ورنہ درحقیقت انسان کی عظمت اسکے کارناموں میں نہیں اس کی ذات میں ہوتی ہے اسرار بھائی نہ مصلح قوم تھے نہ سیاسی راہبر۔ وہ محقق تھے نہ موجد۔ وہ صرف ایک اوسط حیثیت کے زمیندار تھے، انھوں نے یونیورسٹی سے کوئی ڈگری نہیں حاصل کی۔ وہ محکمہ نہر میں ایک متوسط درجے کی ملازمت پر فائز رہے۔ اور ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنے وطن میں آکر اپنی بیوی اور بچیوں کے ہمراہ خاموشی کے ساتھ عزلت نشینی کی زندگی بسر کی، لیکن اس کے باوجود میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک عظیم انسان تھے اور مجھے توقع نہیں کہ ان کا جیسا خلیق، شفیق، شریف النفس اور محبت کرنے والا انسان، میں پھر کبھی دیکھ سکوں گا۔

وہ جگر مرادآبادی کے اس مصرعے کی سراسر تفسیر اور تصویر تھے۔ ع

بس محبت ہی محبت ہوں محبت کی قسم۔

اسرار بھائی مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے جسے ایک نسل کا فاصلہ کہا جاسکتا ہے لیکن وہ میرے والدِ مرحوم کے بھی دوست تھے، میرے بھی، میرے لڑکوں کے بھی اور میرے نواسے اور پوتے کے بھی بے تکلف رفیق اور غمگسار تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ان سے والہانہ لگاؤ اور تعلق تھا۔ ان میں رکھ رکھاؤ اور حسنِ خلق بدرجہ اتم تھا۔ میرے والد مرحوم سے اور ان سے بندگانِ دین کے حالات پر تبصرہ ہوتا تھا۔ سے اور ان سے ادبی اور سیاسی تبادلِ خیال ہوتا۔ میرے لڑکوں سے اور ان سے کریکٹ اور ٹینس پر گفتگو ہوتی۔ اور میرے نواسے (دو تین عمر، سال) اور ان سے چڑیوں اور کتوں کی باتیں ہوتیں وہ خود زیادہ بولتے نہ تھے۔ لیکن دوسروں کی باتیں بڑے انہماک سے سنتے اور درمیان میں کوئی دلچسپ جملہ یا لطیفہ کہہ دیتے

یا زیرِ بحث موضوع میں کسی پُر لطف اور خوشگوار پہلو کا اضافہ کر دیتے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے کبھی جی نہ اکتاتا اور اگر مصروفیات مانع نہ آجائیں تو یہی جی چاہتا کہ ان کو چھوڑ کر ہی نہیں۔ افسوس کسے خبر تھی کہ وہ ہم لوگوں سے اتنی جلد اور ایسے دفعتاً بچھڑ جائیں گے اب افسوس ہوتا ہے۔ ان اوقات پر جو ان کے پاس گذر سکتے تھے لیکن کسی وجہ سے نہیں گذارے ؂

کچھ تو ٹھہر اے گردشِ دوراں، اہلِ نظر دیدار تو کر لیں
پھر یہ لمحہ آئے نہ آئے اس لمحے کو پیار تو کر لیں

ان کی شخصیت کی جاذبیت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ روفی جب بھی لکھنؤ سے آتا ہے بلا کسی کی تحریک کے ان کی قبر پر جاتا ہے۔ ایک دفعہ میری لڑکی عجمہ نے اس سے پوچھا کہ تمہیں تو ابھی فاتحہ پڑھنا بھی نہیں آتا تم اتنی دور اکیلے قبر پر کیوں جاتے ہو، تو اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا "مجھے مم نانا یاد آتے ہیں" اسرار بھائی کو وہ مم نانا کہتا تھا۔ اسرار بھائی کے یہاں وہ جب بھی جاتا وہ اسے کچھ دیتے ضرور تھے۔ کوئی پھول یا پھل، چاکلیٹ، ٹافی، کھلونا، پنسل یا کوئی تصویر، بہر کیف وہ کبھی خالی ہاتھ نہ لوٹتا۔ اس کو دینے کے لئے وہ اکثر چیزیں سینت کر رکھتے لیکن ان میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اس سے باقاعدہ گفتگو کرتے، اور اس کی وہ بچکانہ باتیں جو گھر میں کوئی بھی سننے کیلئے تیار نہ ہوتا وہ توجہ سے سنتے اور اس کے اوٹ پٹانگ لامتناہی سوالوں کا بڑے تحمل سے جواب دیتے۔ چنانچہ روفی جب بھی گھر سے غائب ہوتا ہمیشہ اسرار بھائی کے یہاں ملتا۔ اور صرف روفی سے نہیں انہیں ہر بچے سے فطری انسیت اور لگاؤ تھا اور ہر ایک کیساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے۔

اکثر ایسا ہوا کہ میں ان کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ محلّے کے میلے کچیلے بچّے اُن کے کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھے ہیں۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ نوکر بازار ریزگاری بھیجنے گیا ہے وہ آ گئے تو انھیں پیسے تقسیم کئے جائیں گے۔ پیسے آجاتے تو وہ انھیں خود فرداً فرداً بانٹتے اور کہتے جاتے " دیکھو تم لال غبارہ لینا، تم ریوڑی کی ٹکیا لینا تو منی کو بھی دینا "، " تم اب پھر گھر میں ڈھیلا پھینکو گے تو تمہارے پیسے غفور کو ملیں گے "۔ کوئی غیر معمولی موٹا لڑکا ہوتا تو اس سے خاص دلچسپی لیتے " تم دوڑ کر وہاں تک ہو آؤ تب پیسے ملیں گے "، وغیرہ وغیرہ۔ ان کی طبیعت میں خود بڑا بھولا پن اور معصومیت تھی، اور بچوں کے ساتھ ان کے برتاؤ میں کسی قسم کا تصنع نہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کی ایک روحانی ہم آہنگی ظاہر ہوتی۔ وہ اُن کے ساتھ بہت خوش رہتے۔

ایک روز گیا تو دیکھا کہ اسرار بھائی بے ساختہ ہنس رہے ہیں۔ اور سامنے انیس (اسرار بھائی کی سب سے بڑی صاحبزادی) کی ۸ - ۹ سال کی بچی کتاب کھولے کچھ عجوبہ سی بیٹھی ہے میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تو ہنستے ہوئے بچی کی طرف اشارہ کر کے بولے " یہ زور زور سے گاندھی جی پر اپنا سبق پڑھ رہی تھی دفعتاً یہ رٹنے لگی دھوتی میں گھڑی باندھے بالو! مجھے ہنسی آئی اور میں نے کتاب منگا کر دیکھا تو اس میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے البتہ گاندھی جی کی جو تصویر بنی ہے اس میں ضرور گاندھی جی کی دھوتی سے گھڑی لٹک رہی ہے اب میں اس سے لاکھ کہتا ہوں کہ اسی طرح پھر کہو لیکن یہ نہیں کہتی ہے "۔

بچوں کی طرح انھیں ہر نازک لطیف اور معصوم چیز سے دلچسپی بلکہ محبت تھی، پھولوں سے، پودوں سے، تصویروں سے، اچھے شعروں سے، کتابوں اور رسالوں سے، چڑیوں سے حتیٰ کہ کتّے اور بلیوں سے۔ میں اس آدمی کو یقیناً بڑا

سمجھتا ہوں جو کسی ہسپتال یا کالج کے لئے ایک لاکھ روپئے یا اس سے زیادہ چندہ دیدے اور دوسرے روز اخبار میں اس کی تعریف اور توصیف کے ساتھ اس کی تصویر شائع ہو لیکن میں یقیناً اپنے اسرار بھائی کو اس سے بھی بڑا آدمی سمجھتا ہوں جبکہ میں نے دیکھا ہے کہ مئی جون کے مہینوں میں لو کے جھکڑوں کے درمیان وہ اپنے مکان کے صحن میں لگے پیڑوں کے نیچے چڑیوں کے لئے ٹھنڈا پانی رکھتے پھرتے ہیں میں نے انھیں بٹیروں کو شربت روح افزا پلاتے دیکھا ہے۔ اور محلے کے ایک بیمار کتے کی ایسی مرہم پٹی اور ناز برداری کرتے دیکھا ہے جیسی کوئی دوسرا اپنے کسی بیمار عزیز کی بھی نہ کرے گا۔ اور یہ سب باتیں وہ کسی اجر یا دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے دل کی تحریک پر کرتے۔

خوشنما پھول دیکھ کر وہ ایسے خوش ہوتے جیسے انھیں کوئی بڑی دولت مل گئی ہو۔ اپنے گھر میں پھولوں کے پودوں کو وہ مہنہ ہی مہنہ نہارتے۔ مجھے معظمی مشتاق علی صاحب رئیس رحیم آباد نے چار رنگ کے گلاب دئے تھے۔ اسرار بھائی جو بہت کم اپنے گھر سے باہر نکلتے اکثر میرے یہاں محض ان پھولوں کو دیکھنے آتے اور انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ ایک دن وہ میرے یہاں گیارہ بجے دن میں تشریف لائے۔ میں اس ناوقت آمد پر کچھ متعجب ہوا فرمانے لگے" میرے یہاں کل ایک بہت ہی سرخ گلاب کھلا ہے۔ اب اس کی زندگی کی مدت پوری ہو رہی ہے۔ دیکھنا چاہو تو چلو"، میں ان کے ساتھ گیا تو واقعی وہ گلاب کا پھول اتنا سرخ تھا کہ بعض جگہوں پر مارے سرخی کے سیاہ ہو گیا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ اس پھول کو مجھے دکھا کر کتنا مسرور ہوئے، منکسر المزاج ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ وہ ہر ایک کی دلجوئی اور خوشنودی

کے خواہاں اور کوشاں رہتے ۔ بحث، ضد اور تکرار وہ جانتے ہی نہ تھے، اور معمولی سی معمولی بات میں بھی دوسرے کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھتے، مجھے اکثر شعر یاد نہیں رہتے، صرف ان کا مفہوم ذہن میں رہتا۔ بسا اوقات میں اسرار بھائی کے سامنے ناموزوں اشعار بھی پڑھ دیا کرتا یا صرف مفہوم بتا کر کہتا کہ اب شعر آپ موزوں کر دیجئے ، میری اس کمزوری پر وہ صرف زیر لب مسکراتے اور پھر بلا کچھ کہے ہوئے شعر موزوں کر کے پڑھ دیتے ، غالب ، اقبال ، جگر، حافظ اور ہم خیال لوگوں کے محبوب شاعر تھے میں جوش کا بھی بڑا مداح رہتا۔ وہ ان کی دہریت اور خطیبانہ انداز کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے میں اگر بحث کرنے لگتا وہ خاموشی سے سنتے رہتے اور کبھی تردید نہ کرتے ،

میں نے اسرار بھائی جیسا صلح جو اور شریف النفس انسان نہیں دیکھا۔ ان کی بیوی اپنے بھائی کی وراثت میں حصہ لے سکتی تھیں۔ اور ان کی ایک بہن نے عدالت سے اپنا حصہ پا بھی لیا تھا لیکن اسرار بھائی نے یہ حصہ کبھی نہ مانگا اور نہ اسکے لئے عدالت گئے بلکہ خاموشی سے دست بردار ہو گئے اسی طرح جب ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا اور جب وراثت کی تقسیم کے لئے میں منحصر الیہ بنایا گیا ۔ تو میں نے دیکھا کہ انھیں اپنے حصہ کی بالکل فکر نہ تھی بلکہ جو کچھ فکر تھی وہ یہ کہ ان کی بیوہ بھاوج کو ان کا مہر اور شرعی حق ضرور پہونچ جائے ۔

اسرار بھائی کے یہاں چوری میں ایک ٹائم پیس اور کچھ چیزیں اٹھ گئیں ۔ انھوں نے کوئی رپورٹ نہیں لکھائی ۔ اتفاق سے کچھ دن بعد ٹائم پیس اس لڑکے گھر آمد ہوئی جو گھر میں دودھ دیتا تھا۔ ٹائم پیس انھوں

نے اٹھا کر پھر آتشدان پر رکھدی اور لڑکے سے کچھ نہیں کہا کسی نے کہا بھی کہ اس کو پولس کے حوالہ کر دیجئے۔ تو انھوں نے جواب دیا "یہ بہت شرمندہ ہو چکا ہے" لڑکا اس کے بعد بھی ان کے یہاں بدستور دودھ پہونچاتا رہا۔ ؎

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی

بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اسی طرح ایک دفعہ ایک ملازم ان کا ٹرانسسٹر لے کر غائب ہو گیا انھوں نے نہ کوئی پولس رپورٹ لکھائی اور نہ اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی بلکہ اپنے سے قریب ترین لوگوں تک سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا ایک دن سے مجھسے خود کہنے لگے "کہو تو سلمیٰ کو لکھ دوں لیکن اسے سن کر تکلیف ہوگی، اور ٹرانسسٹر ان کی صاحبزادی سلمیٰ ان کے لئے لائی تھیں۔ اسے اس کی چوری کی اطلاع ہوئی تو وہ پھر دوسرا ٹرانسسٹر لے آئی۔

سلمیٰ ان کو اور وہ سلمیٰ کو بہت چاہتے ایک دفعہ سلمیٰ ان کے لئے عید کے کپڑے سلوا کر لائی میں نے لاعلمی میں پوچھا۔

اسرار بھائی یہ شیروانی کس سے سلوائی آپ نے ہنس کر کہنے لگے میرے لئے میرا لڑکا لایا ہے سلمیٰ جب بھی ملازمت سے آتی کھانے کی بہت سی چیزیں لاتی۔ اسرار بھائی کھاتے کم لیکن کھانے کے شوقین بہت تھے دوسروں کو کھلانے کا شوق اس سے بھی زیادہ تھا جب تک سلمیٰ کی لائی ہوئی تھوڑی تھوڑی ہر چیز مجھے بھجوا نہ لیتے انھیں چین نہ پڑتا۔ وہ بڑی پابندی سے روزے رکھتے اور میں نہ رکھتا لیکن افطاری کی ہر اچھی چیز میں، میں برابر کا شریک رہتا اور میرا حصہ قبل افطار ان کا ملازم میرے گھر پکار کے دے جاتا۔

میری لڑکی صبیحہ کا ایک مضمون کسی رسالے میں چھپا۔ وہ کسی گھر والے کو اپنا مضمون نہ دکھاتی۔ اتفاق سے وہ مضمون اسرار بھائی کی نظر سے گذرا۔ فوراً صبیحہ کو بلا بھیجا اور بڑی شاباشی دی اور انعام کے طور پر اُسے کئی دفعہ مٹھائی اور کھانے کی چیزیں بھیجیں اور اکثر بار بار فرمائش کرتے کہ ایسی ہی کوئی دوسری چیز لکھو۔ وہ ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ پاس ہوئی تو اتنا خوش ہوئے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

اسرار بھائی کی شفقت اور محبت یاد کرتا ہوں اور پھر جب یہ روح فرسا احساس ہوتا ہے کہ اب میں ان سے محروم ہو چکا ہوں تو دل پر سانپ سا لوٹ جاتا ہے۔ میں ان کی کون کون سی باتیں یاد کروں؟ کیا ایسے بے لوث اور پر خلوص انسان پھر کبھی دیکھنے میں آئیں گے؟

میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اسرار بھائی کو بہت قریب سے دیکھا اور میں نے ہمیشہ اخلاقی حیثیت سے انھیں ایک بڑا اور کم یاب انسان پایا۔

وہ اپنے ملازمین کو اپنے عزیزوں جیسا سمجھتے۔ اُن کے کاشتکار آتے تو وہ ہمیشہ انھیں اپنے برابر کرسی پر بٹھاتے اور اپنا حقہ یا سگریٹ پلاتے وہ اپنے نادار عزیزوں کی خفیہ مدد کرتے۔ وہ کبھی کوئی شکایت یا غیبت نہ کرتے وہ کبھی کوئی اپنا حق کسی دوسرے پر نہیں بلکہ ہمیشہ دوسروں کے حقوق اپنے اوپر سمجھتے وہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک کی شخصیت کا احترام کرتے انھوں نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی خود غرضی تصنّع اور پیسے کی محبت ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ ان کی ساری زندگی ایک صاف شفاف اور شیریں چشمے کی مانند

تھی جس میں کبھی کوئی میل نہیں آیا۔

وہ صرف ایک اچھے انسان نہیں تھے بلکہ ان کی علمیت، لیاقت اور ذہانت میں بھی کوئی کلام نہیں تھا لیکن وہ ان سے کبھی بھی دوسرے کو مرعوب یا متاثر کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرتے بلکہ بلا استثنا ہمیشہ کسر نفسی اور نیازمندی ہی کو اپناتے اور کسی کی بھی ذرا سی دل آزاری کرنا وہ گناہ عظیم سمجھتے۔

ایک پھول مرجھا گیا۔

لیکن اس کی خوشبو سے ہمارے دماغ اب بھی معطر ہیں۔

ایک ساز ٹوٹ گیا۔

لیکن اس کے نغمے اب بھی ہمارے رگ و پے میں دوڑ رہے ہیں۔

ایک تصویر مٹ گئی۔

لیکن اس کا حسن اب بھی ہمارے خیالوں کو رنگین بنائے ہوئے ہے۔

ایک انسان مر گیا۔

لیکن اس کی یادوں کا چراغ ہم چاہنے والوں کے آنسوؤں سے ہمیشہ جلتا رہے گا۔

اسرار بھائی ایک بڑے آدمی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان تھے اور اس حیثیت سے وہ کسی بڑے آدمی سے بھی بہت بڑے تھے۔ ان کے جاننے والے کم تھے لیکن ان کم لوگوں کو انہوں نے بہت چاہا، ان کو یاد کرنے والے کم ہیں لیکن یہ کم انھیں قلب کی کن گہرائیوں سے یاد کرتے ہیں یہ نہ پوچھئے۔

اب رہے گی تا قیامت تیرے پانے کی ہوس
بس ہوں تیرا ذکر تیری یاد تیرا غم ہے بس

افواہوں کا رومان

افواہوں کا ذکر آیا تو یادش بخیر اپنے اسکول کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اُردو کا گھنٹہ تھا اور کوئی لڑکا کتاب سے سبق پڑھ رہا تھا۔ اس میں کہیں افواہ کا لفظ آ گیا۔ کسی نے پوچھا "افواہ کیا ہوتی ہے مولوی صاحب۔"

مولوی صاحب نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا "تم بتاؤ جگن ناتھ"
جگن ناتھ نے انتہائی کاہلی سے کھڑے اور جماہی لیتے ہوئے جواب دیا "افوہ کی جمع ہے افواہ۔"

مولوی صاحب اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے اور میز پر رکھی چھڑی کو اُٹھا کر میز کو ایسے پیٹ ڈالا جیسے وہ جگن کی پیٹھ پر ضربیں لگا رہے ہوں۔ کڑک کر انھوں نے حکم دیا "کھڑے ہو جاؤ کُرسی پر افوہ کے بچّے۔" انھوں نے جگن ناتھ کے پاس بیٹھے ہوئے ایک دوسرے لڑکے کی طرف اشارہ کیا "تم بتاؤ!"

دوسرے لڑکے نے سر کھجاتے ہوئے کھڑے ہو کر جواب دیا "واہ کا اسم فاعل ہے افواہ" مولوی صاحب کسی پٹاخے کی طرح پھٹ پڑے "کم بخت نالائقو! کبھی علم تمہیں آسکتا تم کندۂ ناتراشوں کو" اور پھر انھوں نے تیزی سے بڑھ کر چٹاخ پٹاخ دو تھپڑ لگا کر اسم فاعل کو اسم مفعول بنا دیا۔ "مخول کرتے ہو علم سے" اب مولوی صاحب کو واقعی غصہ آگیا تھا۔ انھوں نے کئی لڑکوں کی طرف اشارہ کیا "تم بتاؤ!" لڑکے کھڑے ہوتے گئے اور کہتے گئے "ہمیں نہیں معلوم" "نہیں معلوم مولوی صاحب" کسی ایک نیک بخت نے کہہ دیا "افواہ کے معنی اُڑتی ہوئی خبر" مولوی صاحب کچھ ڈھیلے پڑ گئے معلوم ہوتا کہ جیسے ان کو تھوڑی تسکین ہو گئی ہے اور جو ایک قسم کی جھنجھلاہٹ ان کے چہرے پر ٹنگی ہوئی تھی وہ اُتر گئی ہے۔

مولوی صاحب واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا "مثلاً"

اب ٹنگو جی اُٹھے۔ وہ درجے کے سب سے بڑے طالب علم تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب کو دیکھا، درجے میں چاروں طرف نظر دوڑائی پھر چھت کی طرف منہ کر کے بولے "جیسے افواہ ہے کہ ہمارے کالج کے وائس پرنسپل، جیسے ہی مینیجر صاحب کی موٹی لڑکی سے بیاہ کر لیں گے وہ پرنسپل بنا دئے جائیں گے۔

درجے میں ایک سنسنی خیز سناٹا چھا گیا۔ مولوی صاحب پہلے تو اس بے ساختہ اور بے ضابطہ جواب پر بہت سٹپٹائے پھر اُنھوں نے بات بناتے ہوئے کہا "افواہ جمع ہے فوہ کی۔ فوہ کے معنی ہیں منہ۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ افواہ کے معنی ہوئے بہت سے منہ۔ مجازاً افواہ اس بات کو کہتے ہیں جو بہت سے

موہنوں سے نکلے" اور پھر انھوں نے رازدارانہ لہجے میں سمجھایا "جو بات بہت سے موہنوں یعنی زبانوں سے نکلتی ہے اُس میں ہر کہنے والا اپنی طرف سے کچھ ملاتا ضرور ہے لہٰذا رفتہ رفتہ اس میں سچ کم اور جھوٹ زیادہ ہو جاتا ہے اور اسی وجہ سے افواہوں کو عموماً قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا ہے"۔ گھنٹہ بج گیا مولوی صاحب چلے گئے اور درجہ برخاست ہو گیا لیکن ٹنگو چچا کی اُڑائی ہوئی افواہ چکّر لگاتی رہی، گھومتی اور پھیلتی رہی اور بالآخر سارے کالج پر چھا گئی۔ اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ وائس پرنسپل کی شادی منیجر صاحب کی لڑکی سے واقعی ہو گئی اور چند مہینوں بعد جب پرنسپل ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ وائس پرنسپل کا تقرر ہو گیا۔ ٹنگو چچا قسمیں کھاتے تھے کہ یہ افواہ انھوں نے فی البدیہہ گڑھ کر محض تفنن طبع کیلئے اُڑائی تھی۔

افواہ نہ بالکل سچ ہوتی ہے نہ جھوٹ۔ یہ دراصل حقیقت اور افسانے کا مرکب ہوتی ہے۔ یہ چڑیا نہیں اُڑتی ہے لیکن اس کے اور ایک چڑیا کے اُڑنے میں یہ بنیادی فرق ہوتا ہے کہ چڑیا اُڑتی ہے تو وہ چڑیا ہی رہتی ہے لیکن افواہ جب اُڑتی ہے تو وہ مینڈھک سے ہاتھی بن جاتی ہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ چونکہ سچ وزنی اور جھوٹ ہلکا ہوتا ہے لہٰذا جس افواہ میں جتنا تناسب سے سچ اور جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے وہ اسی تناسب سے تیز یا سست اُڑتی ہے۔ مثلاً اگر ایک افواہ میں بیس فی صدی سچ ہے تو وہ اس افواہ سے مقابلتاً کم تیز اُڑے گی کہ جس میں صرف پانچ فی صدی سچ ہوگا۔

افواہوں کو محض اُڑتی پڑتی خبریں یا غیر مصدقہ قیاس آرائیاں

یا من گڑھنت باتیں کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ واقعات شاہد ہیں کہ افواہوں نے تاریخ کے دھارے ایک دو دفعہ نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار بدل ڈالے ہیں۔ اگر منتھرا کی افواہیں نہ ہوتیں تو ہماری راماین کہاں ہوتی۔ دور کیوں جائیے اگر شاہجہاں کے مرنے کی افواہ نہ اڑتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا حشر کیا ہوتا۔ اور کیا پتہ کہ پھر انگریز ہندوستان آتے بھی یا نہیں۔ اور پھر ہمارے دیش کی تاریخ کیا ہوتی؟

جس ملازمہ نے لال قلعے کی ڈیوڑھی میں اس سوال پر کہ "جہاں پناہ کا مزاج آج کیسا ہے"! سر جھکا اور آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے "بس اب بڑی بات مجھ لونڈی سے نہ کہلوائیے"! دبی زبان سے کہہ دیا تھا کیا وہ جانتی تھی کہ اپنے اس مبہم جواب سے وہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کو کس طرح تہہ و بالا کئے ڈال رہی تھی۔ شاہجہاں کی موت کی افواہ نے جس طرح اور جیسی خوں ریزی اور اس کا جو نتیجہ نکلا اس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر ہماری تاریخ کیا ہوتی اور اس کا اثر ساری دنیا کی تاریخ پر کیا پڑتا؟ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟ کی بھول بھلیاں کے تصور ہی سے ذہن کانپنے لگتا ہے۔

جنگ ہو یا امن، سیاست ہو یا تجارت، ادب ہو یا آرٹ بلکہ میں تو کہوں گا کہ دنیا کی کوئی بھی شے ہو اس کی کامیابی اور ناکامیابی کا بیشتر دارومدار پروپگنڈے پر ہوتا ہے۔ اور پروپگنڈا ہوتا کیا ہے؟ الفاظ کے بہت سے خوشنما خول پیاز کے چھلکوں کی طرح علحدہ کر دینے کے بعد افواہیں اور صرف افواہیں۔

مسولینی نے ایک دفعہ انگریزوں کے خلاف طنزاً کہا تھا" یہ قوم توپ کے بغیر لڑ سکتی ہے لیکن افواہوں کے بغیر نہیں۔ اس کی تجارت سیاست اور جنگ کا سارا دارومدار پروپگنڈے پر ہے"

واقعات خواہ وہ چھوٹے اور معمولی ہوں خواہ بڑے اور دور رس، افواہوں ہی کے گہوارے میں آنکھیں کھولتے اور پرورش پاتے ہیں۔ اور پھر واقعات کا کرتا دھرتا ہوتا کون ہے؟ انسان۔ اور یقیناً یہ ایک بہت دلچسپ اور فکر انگیز حقیقت ہے کہ انسان کے خمیر اور مزاج اس کے اقدار اور معتقدات اس کی پسند اور رجحان میں افواہوں کا فیصلہ کن ہاتھ ہوتا ہے۔ اُن افواہوں کا جو روایات، نظریات، مشاہدات اور تحریکات بن کر غیر شعوری طور سے اس کے دل اور دماغ اور رگ و پے میں سرایت کر چکی ہوتی ہیں۔ اور جن پر اس کے توہمات اور اعتقادات کی بنیاد رکھی ہوتی ہے۔ حضرت جوؔش نے خوب کہا ہے ؎

وہ جھوٹ بار بار جو بولا گیا ہے آج
اس وقت جس کے نام سے ہوتا ہے اختلاج

ڈھلتا رہے گا قالب صوت و کلام میں
چھپتا رہے گا مطبع تبلیغ عام میں

تا آنکہ ایک روز وہی ناسزا دروغ
حاصل کرے گا حلقۂ عالم میں وہ فروغ

اُس جھوٹ کو صداقت اعلیٰ کہیں گے لوگ
آفاق کی حقیقت کبریٰ کہیں گے لوگ

لیکن افواہوں کے لئے جو بادل کے گالے کی طرح نرم و نازک اور خوشبو کی طرح ہلکی پھلکی ہوتی ہیں، اور جن کے لئے "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" والی بات صادق آتی ہے کوئی سنجیدہ بحث کرنا یقیناً بد مذاقی ہوگا۔ افواہوں کا ایک سلسلہ جہاں جھوٹ اور افترا سے ملتا ہے وہاں دوسرا سلسلہ بذلہ سنجی اور خوش مزاجی سے بھی اٹکا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے زیادہ تر موقعوں پر افواہوں میں بڑی رومانیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے ان کی زد میں آنے کے باوجود منھ کا مزا بُرا نہیں ہوتا۔ دیکھئے حضرت غالب اپنے حریف حضرت واعظ کے متعلق کس طرح کی افواہ اڑاتے ہیں۔ صاف الفاظ میں کچھ کہتے بھی نہیں جو ازالہ حیثیت عرفی کی گرفت میں آجائیں لیکن دبی زبان سے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جس کی بنا پر الکشن میں اُن کے اس حریف کی ضمانت تک ضبط ہو سکتی ہے۔

؎ کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے!

اسی طرح محبوب کا دل بُرا کرنے کے لئے اپنے رقیب کے متعلق کیسی حاشیہ آرائی کرتے ہیں اور محبوب کے ساتھ اُس کی محبت کے واضح ثبوت ہی کو اس کے خلاف ورغلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں

؎ غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ظاہر میں محبوب سے بڑا چاؤ دکھاتے ہیں لیکن چونکہ وہ ان کو منھ نہیں لگاتا لہذا اسے طرح طرح سے بدنام بھی کرتے جاتے ہیں۔ ؎

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

گویا کہ شراب پی کر رقیب کے ساتھ ادھر اُدھر رات میں سرگشتی کرنا اُس کے معمولات میں داخل ہوچکا ہے۔ خود اپنے متعلق ایک دفعہ افواہ اُڑا دی تھی کہ میں شہید ہونے والا ہوں اور اس سلسلے میں تماشے کے ٹکٹ کے دام بھی وصول کر لئے تھے لیکن پھر لوگ یہ شکایت کرتے سنائی پڑے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

لیکن یہ دور کی باتیں ہیں۔ آیئے ہم آپ کو افواہوں کے متعلق خود اپنے محلّے کا ایک واقعہ سنائیں کہ افواہ کس طرح اُڑتی اور اُڑتے ہی اُڑتے رسّی کا سانپ بن جاتی ہے۔ ہمارے دوست اور ہمسایہ لالہ مست رام من موجی اور لااُبالی قسم کے انسان تھے ہر کسی سے ان کا مذاق ہوتا اور ہنسنا ہنسانا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا اور اسی کے تحت بعض اوقات وہ شرارت سے جان بوجھ کر اپنے اعزّا و اقربا اور ہمسایوں کے متعلق اُلٹی سیدھی افواہیں بھی اُڑایا کرتے۔ محلّے والے بھی اُن کی اس عادت سے واقف تھے لہذا بُرا نہ مانتے لیکن تلاش میں رہتے کہ موقع ہاتھ آئے تو وہ بھی اُن کی اس عادت کا مزا چکھائیں۔

مست رام عموماً گھر سے باہر یار دوستوں کے یہاں رہتے اور ادھر اُدھر کی باتوں یا تاش، شطرنج اور سینما کی دلچسپیوں میں اپنا وقت گذارتے۔ اکثر وہ دو دو تین تین روز تک گھر کی طرف رُخ بھی نہ کرتے۔

ایک دفعہ انھوں نے اپنے کسی دوست کے یہاں کوئی ایسا پان کھا لیا جس میں چونا بھی زیادہ تھا اور تمبا کو بھی۔ ان کا منھ کٹا اور تمباکو کی شدت معلوم ہوئی تو وہ دوڑے نل پر اور وہاں خوب کُلّیاں اور غرارے کر کر کے اپنا منھ صاف کر ڈالا۔ اور تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر کہیں دوسری جگہ چلے گئے۔ کسی نے کسی سے پوچھا "کیا مست رام کو قے ہوئی تھی بیچارے کا منھ کیسا سرخ ہو گیا تھا؟"

جواب ملا۔ "اجی ایسی لال لال قے ہوئی تھی کہ بیچارا بے حال ہو کر رہ گیا تھا۔" ایک تیسرا شخص جو یہ سُن رہا تھا اس نے فوراً جا کر چوتھے شخص کو بتلایا "ہائے رام غضب ہو گیا! بیچارے مست رام کو خون کی قے ہوئی تھی اور اس کے بعد غریب بے سدھ ہو کر رہ گیا۔"

اور پھر اس افواہ کے پر لگ گئے اور ایک منھ سے دوسرے منھ تک یہ کچھ یوں اُڑنے لگی۔ "بھائی یہ دق کا مرض بڑا چور مرض ہوتا ہے اب مست رام جیسے ہٹے کٹے آدمی کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اُسے یہ روگ ہے۔"

"اجی مجھے بہت پہلے ہی سے معلوم تھا کہ اُسے دق ہے۔"

"صاحب یہ دق بھی بڑا موذی مرض ہوتا ہے جس کے لگ جاتا ہے پھر جان ہی لے کر جاتا ہے۔ اب مست رام ہی کو دیکھو!"

"جاتا کیسے نہیں ہے۔ بہت مجرب علاج موجود ہے اس کا لیکن جب بیچارے مست رام کو اس کی بیوی اور سسرال والے اتنا سکون تو دیتے۔"

"اجی مکانوں کا سارا کرایہ وصول کر کے بیوی رکھ لیتی تھی اور وہ بیچارا

غم غلط کرنے کے لیے ادھر اُدھر دوستوں کے یہاں مارا مارا پھرتا۔"
کہو یہی غنیمت ہے کہ لڑکی کی شادی ہو چکی ہے اور لڑکا نوکر ہے ورنہ غضب ہو جاتا۔"
"اجی اب منھ نہ کھلواؤ کہ اس کے سسرال والوں کا اس کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا؟ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی مٹی سوارت ہو گئی۔"
ایک صاحب نے مست رام کے سالے کو سڑک پر دیکھ پایا تو دوڑ کر اس سے بغل گیر ہو گئے اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "مست رام بھائی کی ناوقت موت سے کلیجہ پھٹ گیا ہے۔"
سالے نے یہ سُنا تو "ہائے جیجا جی" کہتے ہوئے سر پر پاؤں رکھ کر گھر کی طرف بھاگا۔ اُس بیچارے کو مزید تحقیقات کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت۔
مست رام کی اچانک موت کی خبر اُن کی سسرال جو شہر کے قریب ہی ایک گاؤں میں واقع تھی پہونچی تو وہاں کہرام مچ گیا۔ وہاں کے لوگ روتے دھوتے اور اپنے اعزا و اقربا دوستوں اور ہمدردوں کا ایک مجمع لئے شہر میں مست رام کے گھر پر پہونچے تو یہاں بھی نہ صرف گھر میں بلکہ سارے محلے میں ہائے واویلا مچ گیا۔ ہر شخص ایک اضطراب اور انتشار میں مبتلا اظہار غم کر کر کے عبرت پکڑ رہا تھا۔ مست رام کی موت کے متعلق سب کو یقین تھا لیکن صحیح طور سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کب کہاں اور کیسے مرے۔ سسرال والوں کو غلط فہمی تھی کہ مست رام جی کی لاش یہاں گھر کے اندر ہو گی اور گھر والے سمجھ رہے تھے کہ سسرال والے جب اس وثوق سے مرنے کی

خبر لائے ہیں اور اس بے ساختگی سے رو پیٹ رہے ہیں تو لاش اُن کے پیچھے ضرور لائی جا رہی ہو گی۔

افواہیں ضبط و تولید کی بالکل قائل نہیں ہوتیں اور فوراً انڈے بچّے دینا شروع کر دیتی ہیں اور ہر خلا کو اپنی نئی نسلوں سے خود بخود پُر کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جب نہیں معلوم کس حوالے سے کسی نے ٹرکوں کا، اُن کی تیز رفتاری اور ڈرائیوروں کی لاپرواہی کا ذکر چھیڑا تو ایک نئی افواہ نے جنم لے کر مست رام کی لاش کی عدم موجودگی کی گتھی بھی سلجھا دی یعنی وہ ۲ بجے کے قریب بازار سے گھر کی طرف آرہے تھے۔ دفعتاً ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی ٹرک ان کو کچلتی ہوئی نکل گئی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی گئی ہے۔ تعاقب کے بعد ٹرک گرفتار کر لی گئی ہے البتہ ڈرائیور ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ ایک دوسری اطلاع کے بموجب ڈرائیور خود کوتوالی حاضر ہو چکا ہے اور اس نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے بلکہ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ پچھلے سال جو ایک نو دس سال کا بچّہ کچل گیا تھا اور ڈرائیور ٹرک لے کر لاپتہ ہو گیا تھا وہ بھی اُسی کی کارستانی تھی۔

افواہوں میں افواہ اُڑانے والے کی خواہش کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے اور اسی سے سیدھی سادی خبر میں سنسنی اور رنگینی آجاتی ہے۔ چونکہ عام محلے والے مست رام کی بیوی اور سسرال والوں سے خوش نہ تھے کسی نے دلچسپی کی خاطر یہ ایک ہوائی چھوڑ دی کہ مست رام نے کئی سال ہوئے دوسری شادی کر لی تھی اور ان کی اپنے گھر سے غیر حاضری کی یہی وجہ تھی۔

ایک صاحب جو ادھر اُدھر گھوم پھر اور کن پھسکی کر کے افواہوں کو ہوا دے رہے تھے اور ان میں سے دم چھلّے نکال رہے تھے انھوں نے مست رام کے بھائی بجت رام کو آواز دے کر باوازِ بلند کہا "بھائی صاحب یہ مست رام جی کے ٹرک سے کچل جانے میں بھی مجھے کچھ راز معلوم ہوتا ہے۔ میں اسے حادثہ نہیں سمجھتا بلکہ میرا یقین ہے وہ غریب جان بوجھ کر" کہنے والے کی آواز بھرّا گئی اور اس نے سسکیوں اور آنسوؤں کے درمیان اپنا جملہ پورا کیا "مارے گئے ہیں۔ گویا کہ جان بوجھ کر راستے سے ہٹائے گئے ہیں۔"

افواہوں کی پرواز کے لیے یہ ایک نئی فضا فراہم ہو گئی تھی اور افواہ بازوں کو اگر اپنی جولانی طبع دکھانے کا پورا موقع مل جاتا تو یقیناً مست رام جی کے گھر اور سسرال والوں کے درمیان فوراً ہی فوجداری ہو جاتی لیکن اُسی وقت سڑک کے افق پر مست رام جی آتے دکھائی پڑے اور یقین جانیے گا کہ بہتوں کو ان کی شکل دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔

شمع
مُصنّفہ
ڈاکٹر شمع انجم ایف۔آر۔سی۔ایس (لندن)
* ایک ادبی سماجی اور معاشرتی ناول
حدیثِ دل اور زندگی کے ہنگاموں سے لبریز داستان
کچھ غمِ دوراں اور کچھ غمِ جاناں کی تفسیر
محترمہ ڈاکٹر شمع انجم
میڈیکل سائنس کی اعلیٰ ترین سند یافتہ ڈاکٹر ہیں اور حیرت ہوتی ہے
کہ سائنس جیسے خشک موضوع کی طالبہ ہوتے ہوئے موصوفہ نے اتنا پیارا
اور اچھا ناول کیسے لکھا اور مزید حیرت یہ ہوتی ہے کہ موصوفہ نے اپنی مصروفیات
کے شب و روز اس ضخیم ناول کی تصنیف میں صرف کئے ہوں گے۔
ادارۂ اردو پبلشرز فخر کے ساتھ یہ ناول حاصل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے
* خوبصورت گٹ اپ * سفید کاغذ * (نفیس طبع)
اردو پبلشرز۔ تلک مارگ۔ لکھنؤ ۱

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
چشمہ	اے۔ آر۔ خاتون	15/-
ہالہ	〃	12/-
شمع	〃	12/-
زمانہ	〃	8/-
فاکہہ	〃	9/-
تصویر	〃	8/-
شیخو	رضیہ بٹ	8/-
نورین	〃	8/-
لڑکی ایک دل کے ویرانے میں	رشیدہ رضویہ	8/-
سفید کلیاں	فیروز دت سین	6/-
رُوح کے بندھن	مس سعید یوسفی	8/-
نوید	〃	9/-
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	جمیلہ بانو	9/-
قسمت	〃	8/-
پہلی ملاقات	خدیجہ کمال	5/-
وہ بہاریں یہ خزائیں	حجاب امتیاز علی	9/-
حروف حق (مسدس)	حسین اعظمی	2/-
سالار حجاز	نسیم حجازی	12/-
اور تلوار ٹوٹ گئی	〃	10/-
معرکہ شام	صادق سردھنوی	6/-
فتح بیت المقدس	〃	5/-
الفانسو	عبدالحلیم شرر	4/-
رسیلی رات	ضیاء عظیم آبادی	4/-
اور کرن پھوٹی	〃	5/-
مدینہ سے کربلا	〃	8/-
رسیلی آنکھیں	〃	5/-
سسکتے آنسو	احد کمال	4/-
کشتی اور ساحل	ارشاد امروہوی	9/-
عذرا، جیسا ایک دوشیزہ	مسعود جاوید	15/-
لیلائے خالد	〃	6/-
گمراہ	مائل ملیح آبادی	6/-
اندھا	رئیس احمد جعفری	6/-
چاندنی	〃	6/-

برف باری کی رات ــ اے۔ حمید ــ Rs. 4/-

نجمہ اخلاق

کا

نیا رومانی اور جاسوسی ناول

شیشہ تہہ سنگ

نجمہ اخلاق

ناول نگاری کے میدان میں نئی نہیں ہیں۔ لیکن فنی گرفت
اور کردار نگاری کی خوبیاں ان کے شاندار مستقبل کی
نشان دہی کر رہی ہے

امید ہے کہ ناول ـــــ

شیشہ تہہ سنگ

ادبی حلقہ میں پسند کیا جائے گا
کتاب خوبصورت گرد اپ کے ساتھ شائع ہو رہی ہے

(زیر طبع)

اردو پبلشرز۔ تلک مارگ ـــــ لکھنؤ